یکم و ۱۶ مئی ۲۰۲۲ء | بسم اللہ الرحمٰن الرحیم | جلد نمبر: ۱۵ ۔ شمارہ نمبر: ۹-۱۰

پندرہ روزہ
معارف فیچر کراچی
MA'ARIF FEATURE

مدیر: سیّد شاہد ہاشمی

نائب مدیران: منعم ظفر خان، سید سمیع اللہ حسینی، نوید نون ۔ معاون مدیران: غیاث الدین، محمد عمید فاروقی

ڈی ۔ ۳۵، بلاک ۔ ۵، فیڈرل 'بی' ایریا، کراچی ۔ ۷۵۹۵۰

فون: ۳۶۸۰۹۲۰۱_۳۶۳۴۹۸۴۰(۲۱_۹۲)

برقی پتا: irak.pk@gmail.com، ویب گاہ: www.irak.pk

Fortnightly "Maarif Feature" Karachi: REG.No.SC-1303

۱ ۔ **معارف فیچر** ہر ماہ کی یکم اور سولہ تاریخوں کو شائع کیا جاتا ہے۔ اس میں دنیا بھر سے (ہمیں) دستیاب ایسی معلومات کا انتخاب پیش کیا جاتا ہے' جو اسلام سے دلچسپی اور ملت اسلامیہ کا درد رکھنے والوں کے غور و فکر کے لیے اہم یا مفید ہو سکتی ہیں۔
۲ ۔ پیش کیا جانے والا لوازمہ بالعموم بلاتبصرہ شائع کیا جاتا ہے۔ کسی مضمون' نقطہ نظر' خیال یا معلومات کے انتخاب کی وجہ اس سے ہمارا اتفاق نہیں' اس کی اہمیت ہوتی ہے۔ کسی مضمون یا معلومات کی مدلل تردید یا اس سے اختلاف پر مبنی لوازمہ کو بھی جگہ دی جا سکتی ہے۔
۳ ۔ **معارف فیچر** کو بہتر بنانے کے لیے مفید معلومات کے حصول یا ان کے ذرائع تک رسائی میں آپ کی مدد کا خیر مقدم کیا جائے گا۔
٤ ۔ ہمارے فراہم کردہ لوازمے کے مزید' لیکن غیر تجارتی ابلاغ کی عام اجازت ہے۔
۵ ۔ **معارف فیچر** کی کوئی قیمت مقرر نہیں۔ تاہم عطیات کی ضرورت بھی رہتی ہے اور عطیات قبول بھی کیے جاتے ہیں۔ **اسلامک ریسرچ اکیڈمی کراچی**

"ہمیں امریکا کا دشمن نہ سمجھا جائے"

سراج الدین حقانی کا امریکی نشریاتی ادارے سی این این کو انٹرویو

افغانستان کی حکمران طالبان تحریک کے نائب سربراہ اور قائم مقام وزیر داخلہ سراج الدین حقانی نے کہا ہے کہ ہمیں امریکا کا دشمن نہ سمجھا جائے۔ افغانستان میں قائم طالبان کی حکومت امریکا کو دشمن کے طور پر نہیں دیکھتی، اُس سے اچھے تعلقات اُستوار کرنے کی خواہاں ہے تاہم واشنگٹن کے طرزِ عمل کے حوالے سے چند تحفظات ہیں۔ سراج الدین حقانی نے یہ بات افغانستان کے دارالحکومت کابل میں امریکی نشریاتی ادارے سی این این کی کرسٹینا امان پور کو دیئے گئے انٹرویو میں کہی۔ پولیس کی پاسنگ آؤٹ پریڈ میں شرکت کی خاطر دو ماہ کے دوران پہلی بار منظر عام پر آنے کے بعد یہ اُن کا پہلا انٹرویو تھا۔ سراج الدین حقانی اب بھی امریکا کو مطلوب افراد کی فہرست میں شامل ہیں اور اُن کی گرفتاری کے لیے معلومات فراہم کرنے والے کے لیے ایک کروڑ ڈالر کا انعام مقرر ہے۔

جب کرسٹینا امان پور نے پوچھا کہ کیا طالبان اب بھی امریکا کو اپنا دشمن سمجھتے ہیں تو سراج الدین حقانی نے کہا ہے کہ وہ تھوڑی سی وضاحت کرنا چاہیں گے۔ انہوں نے کہا "دو عشروں تک ہمیں اپنے دفاع کی خاطر لڑنا پڑا۔" انہوں نے فروری ۲۰۲۰ء میں قطر کے دارالحکومت دوحا میں طالبان تحریک اور ٹرمپ انتظامیہ کے درمیان طے پانے والے امن معاہدے کا حوالہ تو دیا تاہم تفصیلات بتانے سے گریز کیا۔ سراج الدین حقانی کا کہنا تھا کہ طالبان تحریک چاہے گی کہ امریکا سمیت عالمی برادری سے اچھے تعلقات کی حامل ہو تاہم یہ تعلقات تمام تسلیم شدہ اصولوں کے مطابق ہونے چاہییں۔ انہوں نے صراحت کی کہ جو کچھ طالبان اور امریکا کے درمیان طے پایا ہے اُس کی روشنی میں ہم بھی دوستی اور مفاہمت کی بات کرتے ہیں اور طالبان اب امریکا کو دشمن کی حیثیت سے نہیں دیکھتے۔ ہاں، ماضی میں جو کچھ ہوا اُس کی بنیاد پر امریکی رویے کے حوالے سے چند ایک تحفظات ہیں اور طالبان محتاط ہو کر چل رہے ہیں۔

سراج الدین حقانی کا کہنا تھا کہ افغانستان کی آزادی اور خودمختاری تمام امور پر مقدم ہے اور ہم تمام تسلیم شدہ اصولوں کے مطابق عالمی برادری میں اپنے لیے کوئی مقام چاہتے ہیں۔ "ہم معاہدے پر عمل کے پابند ہیں۔ ہم نے سفارت کاری کی بات بھی کی ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ عالمی سطح پر جن اصولوں کا خیال رکھتے ہوئے تعلقات استوار رکھے جاتے ہیں اُنہی اصولوں کی بنیاد پر امریکا سے بھی ہمارے تعلقات استوار رہیں۔ یہ بھی دیکھنا ہوگا کہ کہیں وہ (امریکا) اپنی کسی بات سے نہ پھرے"۔

انٹرویو کے دوران کرسٹینا امان پور نے سراج الدین حقانی سے کہا کہ بات اُن کے سر کی قیمت اور پابندیوں تک محدود نہیں بلکہ ایک مغربی سفارت کار نے کچھ اور بھی کہا ہے۔ پھر اُنہوں نے بتایا کہ اس انٹرویو سے قبل مغربی سفارت کار نے کہا "اگرچہ سراج الدین حقانی کے ہاتھ بہت سے امریکیوں کے خون سے رنگے ہوئے ہیں طالبان تحریک سے وابستگی کے دوران اُن کا تعلق انتہائی سخت گیر عناصر کی تحریکوں سے رہا ہے مگر سراج الدین حقانی ہی اُن اولین لوگوں میں سے ہیں جنہوں نے اپنی وزارت میں خواتین کو آگے بڑھنے کا موقع فراہم کیا۔ ہم نے سراج الدین حقانی کی وزارت کو انسدادِ دہشت گردی سے متعلق اہم اقدامات کرتے دیکھا ہے۔ اِسے تضاد یا مخمصہ کہنا محض کم بیانی ہوگا۔ یہ صرف میری رائے نہیں ہے بلکہ ہر اُس سفارت کار اور سفیر کی رائے ہے جو اِن معاملات سے کسی نہ کسی طور جُڑا رہا ہے"۔

جب کرسٹینا امان پور نے کہا کہ ایک طرف امریکا آپ کو دہشت گرد کہتا ہے اور دوسری طرف آپ سے بات بھی کرنا چاہتا ہے تو آپ اس حوالے سے کیا کہیں گے تو سراج الدین حقانی نے کہا کہ یہ فیصلہ کرنا تو امریکیوں کا کام ہے کہ مجھ سے مل کر کام کرنا ہے یا نہیں۔ ساتھ ہی ساتھ سراج الدین حقانی نے یہ بھی کہا کہ افغانستان کو زیادہ سے زیادہ محفوظ بنانے کی خاطر طالبان نے امریکی قیادت اور افغان عوام کو مثبت پیغام بھیجا۔ "پہلے ہمارے معاملات بہت حد تک اوٹ میں تھے۔ اب بہت کچھ واضح ہو چکا ہے۔ دنیا ہمیں جان چکی ہے اور ہم بھی اپنے ارادوں کو ڈھانپنے کا ارادہ نہیں رکھتے۔ ملک میں اب بھی کئی حلقے ہمارے بارے میں منفی سوچ رکھتے ہیں مگر اب اُن پر بہت کچھ کُھلتا جا رہا ہے"۔

اندرونی صفحات پر:۔

- سوڈان اسلام پسندوں کا اتحاد و انضمام
- سوویت افغان اور روس یوکرین جنگ کا موازنہ
- بھارت سے کشمیر کے الحاق کی سازشیں
- تیونس میں مطلق العنانیت کا پھیلاؤ
- ہندو قوم پرستی کی سفاک لہر
- تاریخ کا تسلسل اور تہذیبوں کی ہم آہنگی
- کِنگ کرین کمیشن
- بدلتی دنیا ۔ نئے بلاک کی تشکیل
- چین میں گندم کا بحران

انٹرویو کے دوران کرسٹینا امان پور نے افغانستان میں حال ہی میں دہشت گردی کے چند واقعات کا حوالہ دیتے ہوئے سراج الدین حقانی کو یاد دلایا کہ طالبان نے امریکا سمیت عالمی برادری کو یقین دلایا تھا کہ ان کی سرزمین دہشت گردی کے لیے استعمال نہیں ہوگی۔ سوال یہ تھا کہ طالبان اپنے اس عہد پر تا حال قائم ہیں؟ اس سوال کے جواب میں سراج الدین حقانی نے فروری ۲۰۲۰ء میں دوہا میں امریکا سے ہونے والے معاہدے کا حوالہ دیتے ہوئے کہا ''اس معاہدے کے بعد ۱۴ ماہ تک فریقِ ثانی نے طالبان کے معاملے میں اس معاہدے کی خلاف ورزی کی۔ اس کے باوجود ہماری قیادت ہم پر زور دیتی رہی کہ ہم اپنے وعدے پر قائم رہیں اور ملک میں حقیقی امن و استحکام کے حوالے سے جو کچھ بھی کر سکتے ہیں، کرتے رہیں۔ کابل کی فتح تک ہم نے صبر وتحمل سے کام لیا اور جو وعدے کیے تھے اُن پر عمل سے گریز نہیں کیا۔ اندرونِ ملک چند خطرات ہیں مگر بعض حلقے ان خطرات کو کچھ زیادہ ہی بڑھا چڑھا کر پیش کر رہے ہیں تاکہ افغان عوام اور عالمی برادری کو گمراہ کر سکیں۔ کسی بھی حکومت کی طرف سے دنیا کے لیے خطرات پیدا ہو سکتے ہیں مگر ہم عالمی برادری کو یقین دلاتے ہیں کہ ہماری سرزمین کی طرف سے کسی کے لیے کوئی خطرہ نہیں''۔

سی این این کی رپورٹر نے سراج الدین حقانی کو یاد دلایا کہ طالبان کے دوبارہ اقتدار میں آنے سے قبل انہوں نے نیو یارک ٹائمز میں شائع ہونے والے اپنے ایک مضمون میں یقین دلایا تھا کہ طالبان دوبارہ اقتدار میں آئے تو تمام افغان شہریوں کے حقوق مساوی ہوں گے، خواتین کو بھی تعلیم سمیت تمام حقوق ملیں گے۔ فیصلے میرٹ کی بنیاد پر ہوں گے اور کسی کی حق تلفی نہیں کی جائے گی۔

سراج الدین حقانی نے کہا ''یہ ساری باتیں ایک ایسے ماحول میں کہی گئی تھیں جب طالبان کے اقتدار کے آثار نہ تھے۔ کابل میں ایک ایسی حکومت تھی جو ہمارے بارے میں بدگمانیاں پھیلاتی تھی۔ ہم چاہتے تھے کہ پُرامن طریقے سے اقتدار میں آئیں۔ ایسا ہی ہوا۔ اب ہم ایسا ماحول پیدا کرنے کی کوشش کر رہے ہیں جس میں سب کے لیے مساوی حقوق ہوں، کسی کی حق تلفی نہ ہو اور ہم اپنے تمام وعدے پورے کر سکیں''۔

جب کرسٹینا امان پور نے پوچھا کہ کیا وہ خواتین کی تعلیم کے حق میں ہیں تو سراج الدین حقانی نے کہا ''ہم خواتین کی تعلیم کے خلاف نہیں۔ پانچویں جماعت تک کی بچیوں کو اسکول جانے کی اجازت ہے۔ ہم ایسا ماحول تیار کر رہے ہیں جس میں ثانوی جماعت کی بچیاں بھی اسکول جاسکیں۔ طالبان قیادت یا کابینہ کی سطح پر لڑکیوں کی تعلیم کے حوالے سے کوئی منفی رجحان نہیں پایا جاتا۔ سوال تیاریوں کا ہے۔ وزارتِ تعلیم نے جو نوٹیفکیشن جاری کیا ہے اُس کے تحت ابھی چند ایک معاملات میں تیاریاں مکمل نہیں۔ میں اس چینل کے

باقی صفحہ نمبر ۱۴

سوڈان اسلام پسندوں کا اتحاد و انضمام

سوڈان کی فوجی جنتا اور سابق صدر عمر حسن البشیر کی جماعت کے درمیان تعلقات میں بہتری کے آثار ہیں۔ سابق حکمران پارٹی کے نمایاں رہنما اور سابق وزیر خارجہ ابراہیم غندور کو جیل سے رہا کر دیا گیا ہے۔ سابق صدر خود بھی جیل کی کال کوٹھری کی بجائے دارالحکومت خرطوم کے ایک اسپتال کی راہداری میں چہل قدمی کرتے دکھائی دے رہے ہیں۔

برادر اسلامی ملک کے سیاسی منظرنامے میں تازہ ہوا کا یہ خوشگوار جھونکا ایسے وقت میں آیا ہے، جب ۱۰ اسلام پسند پارٹیوں نے مل کر چلنے، باقاعدہ اتحاد بنانے اور پھر آخرکار انضمام پر اتفاق کرتے ہوئے گزشتہ روز دارالحکومت خرطوم میں ایک اعلامیہ پر دستخط کیے۔ یہ عوامی تقریب رمضان المبارک میں غزوہ بدر اور یوم الفرقان کی یاد منانے کے لیے منعقد کی گئی تھی جس میں ہزاروں لوگ شریک ہوئے۔

اعلامیہ میں واضح کیا گیا ہے کہ اتحاد کا یہ ابتدائی قدم آنے والے مراحل کی تیاری کے لیے اٹھایا جا رہا ہے۔

جن دس پارٹیوں نے باہم انضمام کا فیصلہ کیا ہے ان میں اخوان المسلمون کی عالمی تنظیم، اخوان المسلمون سوڈان، منبر السلام العادل، تحریک اسلامی سوڈان، تحریک نہضۃ سوڈان، دولۃ القانون والتنمیۃ پارٹی تحریک اصلاح وترقی، اب اصلاح پارٹی، قومی انصاف پارٹی وغیرہ شامل ہیں۔

بیان میں کہا گیا ہے کہ مسلمانوں کا اتحاد شرعی فریضہ ہے اور حالات کا تقاضا بھی یہی ہے۔ خصوصاً ایک ایسے وقت میں جب ریاست کے وجود کو خطرات لاحق ہو چکے ہوں اور اس کی شناخت کو مٹانے اور اس کے بلند اصولوں کو مٹانے کے جتن کیے جا رہے ہوں۔

تقریب سے خطاب کرتے ہوئے اب اصلاح پارٹی کے نائب صدر حسن رزق نے کہا کہ پہلے مرحلے میں ان جماعتوں کے درمیان باہم رابطے کا فیصلہ ہوا ہے بعد ازاں جزوی اتحاد ہوگا اور پھر دستور اساسی اور بنیادی فورمز کی تشکیل کے بعد مکمل انضمام ہو جائے گا۔

امین حسن عمر نے تحریکِ اسلامی اور سابق صدر عمر حسن البشیر کی پارٹی کی نمائندگی کرتے ہوئے کہا کہ اس اتحاد کا بنیادی مقصد اسلام اور اسلام پسندوں کے خلاف جاری مہم کا مقابلہ کرنا ہے۔

پس منظر

۱۱ر اپریل ۲۰۱۹ء کو عوامی احتجاج کے بعد سابق صدر عمر حسن البشیر کی حکومت کا خاتمہ ہوگیا اور فوج نے حریت و تغیر کے پلیٹ فارم پر جمع بائیں بازو کے نظریات کی حامل پارٹیوں کے اشتراک سے عبوری حکومت قائم کی۔ ان پارٹیوں نے ڈی امپاورمنٹ کمیشن کے نام سے اسلامی نظریات کے حامل مقتدر افراد کو چُن چُن کر نکالنے، ان کے خلاف مقدمات کھڑے کرنے اور انہیں جیلوں میں ٹھونسنے کا عمل شروع کر دیا۔ اس سارے عرصے میں اسلام پسندوں کی صفیں انتشار وافتراق کا شکار رہیں۔

بائیں بازو کے نظریات کی حامل جماعتوں نے عبوری عرصۂ اقتدار میں ملک میں رائج شرعی قوانین کے خاتمے کا بیڑا بھی اٹھا لیا۔ مرتد کی شرعی سزا موقوف کر دی گئی۔ ۱۲ جولائی ۲۰۲۰ء کو غیر مسلموں کے لیے شراب نوشی جائز قرار دے دی گئی۔ شورش کے شکار علاقوں کی بعض سیاسی قوتوں کے ساتھ باقاعدہ سمجھوتہ کیا گیا کہ ملک کے آئندہ دستور کی اساس شریعتِ اسلامیہ نہیں بلکہ سیکولرازم کو بنایا جائے گا۔

تاہم سابق صدر عمر حسن البشیر کے دور میں جنرل کے عہدے پر فائز عبدالفتاح برہان نے ۲۶ راکتوبر ۲۰۲۱ء کو عوامی اضطراب اور احتجاجی مظاہروں کے بعد ایک حکم نامے کے ذریعے حریت وتغییر میں شامل پارٹیوں کو اقتدار سے نکال باہر کیا۔ اس اقدام کے نتیجے میں فوج، سابق صدر عمر حسن البشیر کی پارٹی اور دیگر اسلام پسند سیاسی قوتوں کے درمیان قربت میں اضافہ دیکھنے میں آیا۔

سوویت افغان اور روس یوکرین جنگ کا موازنہ

Milton Bearden

جیسے جیسے روسی صدر ولادی میر پیوٹن کے یوکرین پر حملے میں پیش رفت ہو رہی ہے، ویسے ویسے یہ واضح ہوتا جا رہا ہے کہ تقریباً کچھ بھی منصوبے کے مطابق نہیں ہوا ہے۔ روسی فوج جو کہ یہ سوچ رہی تھی کہ اس کا استقبال ایک نا دہندہ کے طور پر کیا جائے گا اس کے برعکس اسے نفرت اور دشمنوں جیسے سلوک کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ فوری طور پر سر تسلیم خم کرنے کے بجائے، یوکرینیوں نے ثابت کیا ہے کہ وہ روسی پیش قدمی کو روکنے اور ہر قیمت پر لڑنے کے لیے پرعزم ہیں۔ یہاں تک کہ اس وقت جب حملے کو ایک ماہ گزر چکا ہے، پیوٹن کو اندازہ نہیں تھا کہ یہ جنگ اتنی طویل ہو جائے گی، اس طرح کی اطلاعات سامنے آ رہی ہیں کہ روسی فوج اسلحے اور خوراک کی ترسیل کے مسائل کا شکار ہونے کی وجہ سے اس کے حوصلے پست ہو رہے ہیں۔ امریکی خفیہ ایجنسی کے حکام کا کہنا ہے کہ ایک اندازے کے مطابق جنگ کے پہلے ۲۰ دنوں میں ۷ ہزار روسی فوجی مارے جا چکے ہیں اور گزشتہ ماہ میں روسی فوج اپنے پانچ جرنیلوں سے بھی ہاتھ دھو بیٹھی۔ تمام اشارے اس بات کی گواہی دے رہے ہیں کہ روس کے پاس فتح کی کوئی واضح منصوبہ بندی نہیں ہے۔ اور یہ جنگ نہ صرف کریملن بلکہ پیوٹن کے لیے بھی خطرناک ثابت ہو رہی ہے۔

وہ لوگ جنھیں سوویت یونین کی تاریخ یاد ہو انھیں اندازہ ہوگا کہ آج کے واقعات اور ماضی کے واقعات میں کافی مشابہت پائی جاتی ہے۔ یوکرین کی طرح افغانستان پر حملہ بھی اس سوچ کے تحت کیا گیا کہ یہ خطہ ہمارے اثر و رسوخ سے نکل رہا ہے۔ اس وقت کی قیادت نے بھی پیوٹن کی طرح یہ سوچا تھا کہ ہماری فوج کو کسی خاص مزاحمت کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا اور ہم تیزی سے افغانستان پر قبضہ کر لیں گے، اور امریکا اور یورپ بھی اپنی دیگر مصروفیت کی وجہ سے اس طرف توجہ نہیں دے پائے گا۔ اور روسی حکمران اپنی مرضی کی حکومت تشکیل دے لیں گے۔

اس ساری منصوبہ بندی میں سے کچھ بھی منصوبے کے مطابق نہ ہو پایا۔ اس کے بجائے، افغانستان روس کے لیے تباہ کن خارجی ایڈونچر میں تبدیل ہو گیا۔ افغان باغیوں نے اپنے آپ کو موثر ترین گوریلا فوج کے طور پر منظم کر لیا اور پاکستان میں محفوظ پناہ گاہیں بھی ان کو میسر آ گئیں، جہاں پاکستانی ایجنسیوں نے ان کی تربیت کا انتظام بھی کیا۔ سوویت حملے کے چند ہفتوں کے اندر، امریکی صدر جمی کارٹر نے پاکستان کے ساتھ ایک اتحاد قائم کیا۔ اس کوشش میں جلد ہی چین، مصر، برطانیہ اور سعودی عرب نے افغان مزاحمت کی حمایت کے لیے شمولیت اختیار کی۔ ان کے خلاف کیا کیا جائے گا۔ سوویت یونین چوں کہ اس سب کے لیے تیار نہیں تھا، نتیجہ یہ نکلا کہ روسی فوج افغانستان میں بُری طرح سے پھنس گئی اور ملکی معیشت کا بیڑا غرق ہو گیا اور اس سب کے طویل مدتی نتائج سوویت یونین کے ٹوٹ جانے کے طور پر سامنے آئے۔

بلاشبہ ۲۰۲۲ء میں روس ۱۹۷۹ء کا سوویت یونین نہیں ہے۔ لیکن پیوٹن کے یوکرین ایڈونچر اور افغانستان میں سوویت جنگ کے درمیان جو حیرت انگیز مماثلتیں ابھر کر سامنے آ چکی ہیں، اس کے پیش نظر اس سے پہلے کے تنازع کی وضاحتی خصوصیات اور اس کے دور رس اثرات کا جائزہ لینا ضروری ہے۔ اگر یوکرین پر حملہ اسی طرح جاری رہتا ہے جیسا کہ یہ اب تک جاری ہے تو یہ روس کے لیے اکیسویں صدی کا سب سے گہرا زخم ثابت ہوگا اور ماضی کی طرح پیوٹن حکومت اور خود پیوٹن کی بقا کے لیے بھی خطرہ بن سکتا ہے۔

ماضی سے کوئی سبق نہ سیکھا

پیوٹن نے جس طرح یوکرین پر حملے سے قبل غیر ذمہ دارانہ بیان دیے اور حملے کی کھلے عام دھمکی دی اس کے برعکس سوویت یونین نے جب افغانستان پر حملہ کیا تھا تو اسے مکمل طور پر خفیہ رکھنے کی کوشش کی تھی۔ ۱۹۷۹ء کے اواخر میں، کے جی بی کے خفیہ تجزیوں نے غلط نتیجہ اخذ کیا تھا کہ افغانستان مغرب کے مدار میں پھسل رہا ہے اور اس ملک میں امریکی فوجی اڈہ امریکا کو اس بات کی اجازت دینے کے مترادف ہوگا کہ وہ سوویت یونین کو ایٹمی میزائلوں سے مکمل گھیرے میں لے لے۔ سوویت رہنماؤں کو یہ خدشہ بھی تھا کہ اگر افغانستان کو واشنگٹن کے اثر و رسوخ کے دائرے میں کھینچ لیا گیا تو یہ وارسا معاہدے کی اقوام میں اپنے اثر و رسوخ کو استعمال کرے گا۔ ”بریزنیف نظریے“ کے مطابق، جس نے اعلان کیا تھا کہ سوویت بلاک کے کسی بھی ملک میں سوشلسٹ حکمرانی کو خطرہ تمام سوشلسٹ ریاستوں کے لیے خطرے کے برابر ہے، ان خدشات نے فوجی مداخلت کا جواز پیش کیا۔ اس طرح ۱۲/دسمبر ۱۹۷۹ء کو، سوویت وزیر دفاع دیمتری اوتینوف، کے جی بی کے سربراہ یوری اینڈروپوف اور سوویت وزیر خارجہ آندرے گرومیکو نے مختصر اور ہدفی مداخلت کو ذہن میں رکھتے ہوئے سوویت فوج کا ایک ”محدود دستہ“ افغانستان روانہ کرنے کی تجویز کا مسودہ تیار کیا۔ اور اس کے چند دن بعد افغانستان پر حملے کا آغاز کر دیا گیا۔

ابتدائی مرحلے میں افغان حملہ پیوٹن کے یوکرین حملے کے مقابلے میں کہیں زیادہ کامیاب رہا تھا۔ کرسمس کی شام سوویت فوج کے ہوائی دستے اور خصوصی فوج کے دستے پیراشوٹ کی مدد سے کابل میں اترے اور بہت تیزی سے انھوں نے کابل کے تزویراتی مقامات پر قبضہ کر لیا۔ اور وہاں کے حکمران حفیظ اللہ امین اور اس کی کابینہ کے اہم لوگوں کو قتل کر دیا گیا۔ اور ان کی جگہ روسی نواز ببرک کارمل کو حکمران نامزد کر دیا گیا، جو کہ روسی فوج کے ٹینکوں پر بیٹھ کر کابل میں داخل ہوا تھا۔ اس طرح سوویت فوج نے بہت تیزی سے افغانستان کے بڑے شہروں جلال آباد، قندھار، ابل اور مزار شریف پر قبضہ کر لیا۔ بگرام کا ہوائی اڈہ سوویت یونین کے ہوائی اڈے میں تبدیل کر دیا گیا۔ چند ہفتوں میں افغانستان بظاہر سوویت یونین کے زیر قبضہ آ چکا تھا۔

تاہم پیوٹن کی طرح سوویت یونین نے بھی مغربی ردعمل کا بالکل غلط اندازہ لگایا تھا۔ جب افغانستان پر حملہ کیا گیا تو KGB کا تجزیہ تھا کہ ”اس بات کا بہت کم امکان ہے کہ امریکا اس حملے کو چیلنج کرے گا“۔ اس حملے سے چند برس پہلے ہی امریکا ویت نام سے شکست کھا کر نکلا تھا، اس KGB کا خیال تھا کہ ایسے حالات میں ایک کمزور صدر جو اس وقت ایران میں پھنسے امریکیوں کو نکالنے کے بحران کا بھی سامنا کر رہا تھا وہ کسی صورت بھی افغانستان کے معاملے میں اپنی ٹانگ نہیں اڑائے گا۔ لیکن مغرب سوویت یونین کے سوچ سے کہیں زیادہ ”چوکس“ تھا۔ امریکی صدر جمی کارٹر نے، اس خوف سے کہ کہیں ہمارے ردعمل میں کسی بھی قسم کی کمی روسی حملے کو تقویت دے، روس کو گندم کی فروخت منسوخ کر دی، اور قونصلر معاہدوں کو بھی منسوخ کر دیا گیا اور آئندہ برس ۱۹۸۰ء میں ہونے والے ماسکو اولمپکس کے بائیکاٹ کا بھی اعلان کر دیا۔ پس پردہ امریکی صدر نے سی آئی اے کو خفیہ طور پر افغان مزاحمتی تحریک کو مہلک مواد سمیت آلات کی فراہمی شروع کرنے کا حکم دیا۔ چند ہفتوں کے اندر، سی آئی اے نے ہزاروں اینفیلڈ ۳۰۳ رائفلیں پاکستان کو مجاہدین میں تقسیم کرنے کے لیے فراہم کر دی تھیں اور جلد ہی راکٹ، مارٹر اور

رائفلیں بھی بھیج دیں۔ افغان مزاحمت کے لیے کُل امریکی فنڈنگ پہلے سال تقریباً ۱۰۰ ملین ڈالر سے بڑھ کر چوتھے سال میں ۵۰۰ ملین ڈالر تک پہنچ گئی۔ جنگ کے آخری دو سالوں میں، یہ فنڈنگ ایک ارب ڈالر سے بھی زائد کی رہی۔

سوویت یونین کا افغانستان کی مزاحمتی طاقت اور مغربی حمایت کا غلط اندازہ اس کے لیے تباہ کن ثابت ہوا۔ سوویت راہنماؤں نے یہ تصور بھی نہیں کیا تھا کہ ایک آسان اور تیز ترین فوجی مداخلت دہائیوں تک جاری رہنے والی خوں ریز جدوجہد میں تبدیل ہو جائے گی۔ اس تنازع کی انسانی تباہی کی گونج پورے خطے میں سنائی دی۔ تقریباً دس لاکھ افغان مارے گئے، پندرہ لاکھ لوگ زخمی ہوئے، تیس لاکھ نے ایران اور پاکستان میں پناہ لی، اور ایک نامعلوم تعداد داخلی طور پر بے گھر ہو گئی۔ یہ سب کچھ ۲ کروڑ سے بھی کم آبادی والے ملک کے ساتھ ہوا۔ سوویت یونین نے بالآخر اعتراف کیا کہ اس تنازع میں اس کے ۱۵ ہزار فوجی مارے گئے۔ حالانکہ یہ تعداد شاید ۵۲ ہزار کے لگ بھگ تھی۔ ۱۹۸۵ء میں میخائل گورباچوف کے اقتدار میں آنے تک، سوویت یونین کے وہ رہنما جنھوں نے سرخ فوج کو افغانستان میں اتارا تھا، منظر سے ہٹ چکے تھے، لیکن سوویت فوج جنگ میں خون، خزانہ اور اپنی بین الاقوامی ساکھ کو مسلسل داغ دار کر رہی تھی۔ بالآخر امریکی حمایت سے مسلح افغان مزاحمت مارچ میں تیز تر ہو گئی۔ گورباچوف نے اپنے کمانڈروں کو حالات کا رخ موڑنے کے لیے ایک سال کا وقت دیا، لیکن وہ ایسا نہیں کر سکے۔ بالآخر ۱۵ فروری ۱۹۸۹ء کو سوویت فوج پیچھے ہٹ گئی۔

افغانستان سے انخلا سوویت یونین کے زوال کا آغاز ثابت ہوا، اس جنگ کے بعد ایسے واقعات پیش آئے کے دنیا کا نقشہ ہی بدل گیا۔ سوویت بلاک اور وارسا معاہدے کے اندر موجود ممالک نے سوویت یونین کو افغانستان سے نکلتے دیکھا، تو یہ نتیجہ اخذ کیا کہ سوویت وزیراعظم میخائل گورباچوف کے پاس کسی بھی نئی فوجی مہم کی ہمت اور گنجائش نہیں ہے اور انھیں شکست خوردہ روس نظر آنے لگا۔ اسی طرح مئی ۱۹۸۹ء میں، ہنگری کی حکومت، جو کہ شاید سوویت شراکت داروں میں سب سے زیادہ قریبی تھی اس نے اپنی سرحد پر لگی خاردار باڑ کو ہٹا دیا، جس سے مشرقی جرمنی کے سیکڑوں لوگ مغربی جرمنی کی طرف فرار ہو گئے۔ اس کے اگلے ہی ماہ، پولینڈ کے لوگوں نے چھ دہائیوں میں پہلی مرتبہ آزادی سے ووٹ ڈالا، جس کے نتیجے میں حکومت مخالف نوبل امن انعام یافتہ Lech Walesa وزیراعظم بن گئیں اور چار دہائیوں پر مشتمل کمیونزم اختتام کو پہنچا۔ اسی سال موسم گرما میں، مشرقی جرمنی میں حکومت مخالف مظاہرے اپنے عروج پر پہنچے اور لوگوں نے دیوار برلن کو بھی عبور کیا۔ ایک سال سے بھی کم عرصے کے بعد، چیکوسلواکیہ اور رومانیہ نے بھی ماسکو کے ساتھ تعلقات سے کنارہ کشی اختیار کر لی۔ مشرقی اور مغربی جرمنی دوبارہ سے ایک ہو گئے اور نیٹو کے رکن بن گئے۔ ۱۹۹۱ء میں یوکرین نے آزادی کا اعلان کر دیا۔ ۱۹۹۱ء کے باکسنگ ڈے پر، روسی فوجیوں کے ایک چھوٹے سے گروہ نے کریملن کی دیوار پر مارچ کیا، سرخ اور سونے کے ہتھوڑے اور درانتی کو آخری بار نیچے کیا، اور روسی سفید، نیلے اور سرخ پرچم کو ہوا میں بلند کر دیا۔ یہ وہ تکلیف دہ واقعات تھے جو کم از کم افغان تباہی کے نتائج کے طور پر سامنے آئے۔ اور پیوٹن نے ان واقعات کو مشرقی جرمنی میں تعینات KGB کے ایک نوجوان افسر کے طور پر قریب سے دیکھا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ سوویت یونین کے خاتمے کو ''بیسویں صدی کا سب سے بڑا المیہ قرار دیتے ہیں۔ لیکن ایسا لگتا ہے کہ انھوں نے ان واقعات سے غلط سبق سیکھا ہے۔ صدر پیوٹن نے کھوئی ہوئی روسی سلطنت کو دوبارہ حاصل کرنے اور یوکرین کو امریکا کے اثر و رسوخ سے نکالنے کے لیے یوکرین پر افغانستان طرز کا حملہ کر دیا۔ محسوس ایسا ہو رہا ہے کہ وہ تاریخ کو پلٹنے چلے تھے لیکن وہ اسے دہرا رہے ہیں۔

یوکرین پر پیوٹن کا حملہ افغانستان پر سوویت حملے سے بھی زیادہ خوفناک لگتا ہے۔ روس کی سلامتی کونسل کے ٹیلی ویژن پر دیکھے جانے والے اجلاسوں سے پتا چلتا ہے کہ پیوٹن کے قریبی مشیروں کو بھی حملے کے منصوبوں کے بارے میں مکمل طور پر آگاہ نہیں کیا گیا تھا اور ایسا لگ رہا ہے کہ ان کے تحفظات بھی تھے۔ اور سوویت یونین کی ابتدائی کامیابی کے برعکس، حملہ شروع سے ہی بُری طرح ناکام ہوا ہے۔ جیسا کہ آغاز میں بڑے شہروں پر قبضہ کرنے یا ان پر قابو پانے میں ناکامی اور ابتدائی چند ہفتوں میں ہلاکتوں کی تعداد میں خاصا اضافہ ہوا ہے۔ اتنی ہلاکتیں تو افغان جنگ میں کافی عرصہ گزرنے کے بعد بھی نہیں ہوئی تھیں۔

مزید برآں، پیوٹن کو یوکرین میں سوویت افواج کے مقابلے میں کہیں زیادہ مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا ہے، جس کی وجہ سے وہ مزید پُرتشدد حربوں کا سہارا لے رہے ہیں۔ پہلے ہی اسپتالوں، رہائشی عمارتوں اور ایک پرہجوم تھیٹر پر روسی حملوں نے صدر بائیڈن کو مجبور کیا کہ وہ پیوٹن کو جنگی مجرم کے طور پر پیش کریں۔ جس کے جواب میں انہوں نے سخت الفاظ میں اعلان کیا ہے کہ وہ امریکا کے ساتھ تمام سفارتی تعلقات منقطع کر سکتے ہیں۔ اگر پیوٹن نے گروزنی جنگ کی طرح کا طرز عمل اختیار کیا تو وہ مزید بمباری اور دیگر ہتھکنڈے استعمال کرے گا۔ جس کے نتیجے میں افغانستان کی طرح کی صورت حال پیدا ہو گی جہاں روسی بمباری کے نتیجے میں ایک تہائی ہلاک، زخمی اور لاکھوں لوگ بے گھر ہو گئے جو وہاں سے ہجرت کر کے ایران اور پاکستان گئے۔

اس موڑ پر اگر بات چیت سے معاملہ حل نہیں ہوتا تو محسوس یہ ہوتا ہے کہ روسی صدر پیوٹن کیف پر شدید لڑائی کے بعد قبضہ کرنے کے خواہاں ہیں۔ اگر ایسا ہو بھی جاتا ہے اور روسی صدر کیف پر قبضہ کر لیتے ہیں اور ماسکو نواز حکومت بنا دیتے ہیں تو بھی یہ مسئلے کا حل نہیں بلکہ یہ مسائل کا آغاز ہو گا۔ افغانستان کی طرح یوکرین میں بھی یورپی مدد سے وہاں گوریلا جنگ کا آغاز ہو جائے گا جو روس کو کبھی مستحکم نہیں ہونے دے گا۔

صرف یوکرین کا رقبہ کسی بھی قسم کے روسی قبضے کے لیے سنگین مسائل کا باعث بنے گا۔ ٹیکساس جتنے علاقے پر محیط اس ملک کی آبادی چار کروڑ سے زیادہ ہے۔ ۱۹۷۹ء کا افغانستان جو کہ ایک بالکل الگ تھلگ، خشکی سے گھرا ہوا اور پہاڑی علاقہ تھا جہاں سامان اور ہتھیاروں کی ترسیل کے لیے خچروں اور ٹرینوں کی ضرورت پڑتی تھی۔ افغانستان کے مقابلے میں یوکرین معقول حد تک جدید ملک ہے جس میں سڑکیں اور نقل و حمل کے اچھے نیٹ ورک ہیں۔ اس کی ۸۵۰ میل لمبی زمینی اور سمندری سرحدیں پولینڈ، ہنگری، سلوواکیہ اور رومانیہ کے ساتھ ہیں اور یہ تمام نیٹو ممالک ہیں۔ اگرچہ اس میں ناہموار، پہاڑی علاقے کی کمی ہے جس نے افغان باغیوں کو بھاری ہتھیاروں سے لیس سوویت فوج کا مؤثر طریقے سے مقابلہ کرنے میں مدد کی، یوکرین کا وسیع جغرافیہ، مضبوط مواصلاتی نیٹ ورک اور مغربی طاقتوں سے قربت اس کے باغیوں کو بھی بڑا فائدہ دے گی۔

۱۹۸۰ء کی دہائی میں افغان مزاحمت کی طرح، پاکستان میں اپنی محفوظ پناہ گاہوں کے ساتھ، یوکرین کی شورش بھی پڑوسی ممالک کے علاقوں سے فائدہ اٹھا سکتی ہے۔ پہلے ہی ان سرحدوں سے متصل نیٹو ممالک میں داخل ہونے والے لاکھوں یوکرینی پناہ گزینوں سے ہمدردی اور حمایت کی جا رہی ہے۔ آنے والے دنوں اور ہفتوں میں، جیسے جیسے جنگ پورے ملک کو اپنی لپیٹ میں لینے کی طرف بڑھ رہی ہے، امکان ہے کہ ان پناہ

گزینوں میں سے لڑائی کی عمر کے یوکرینی باشندوں کی ایک بڑی تعداد کو فوج میں شامل کیا جائے۔ یہ جنگجو پناہ نہیں بلکہ محفوظ پناہ گاہیں تلاش کررہے ہوں گے، جہاں وہ اپنے ملک پر روسی قبضے کے خلاف تقریباً مربوط مزاحمتی قوت کے طور پر خود کو منظّم، تربیت اور مسلح کرنا شروع کردیں گے۔ امریکا اور اس کے نیٹو اتحادیوں کو روس کے خلاف ابھرتی ہوئی شورش کو فنڈنگ کرنے میں کوئی زیادہ دیر نہیں لگے گی۔ اور یہ مسلح جدوجہد روس کے لیے سیاسی، سماجی اور اقتصادی طور پر بہت مہنگی پڑ سکتی ہے۔ یوکرین جیسے ملک میں قابض افواج کو قبضہ برقرار رکھنے کے لیے سپلائی لائن کو ہر صورت میں بحال رکھنا ہوگا۔

حالیہ شورشوں کے ریکارڈ سے پتا چلتا ہے کہ کسی بھی طویل قبضے کی صورت میں پیوٹن کے خلاف مشکلات میں اضافہ ہوگا۔ دوسری جنگ عظیم کے خاتمے کے بعد کی دہائیوں میں، غیر ملکی حملہ آور قوتوں کے خلاف قوم پرستی پر مبنی شورشیں تقریباً ہمیشہ ہی غالب رہی ہیں، جیسا کہ افغان مزاحمتی جنگجو سوویت یونین کے خلاف کرتے تھے۔ اس تاریخی حقیقت نے پیوٹن کو ایک کمزور پوزیشن پر لا کھڑا کیا ہے۔ اگر پیوٹن جنگ جیت جاتا ہے اور یوکرین میں امن قائم کرنے میں کامیاب ہوجاتا ہے، جو کہ ایک انتہائی غیر متوقع نتیجہ ہوگا، اور اپنے آپریشن کو مکمل کرنے کے اعلان کے بعد روسی فوج کی واپسی کا اعلان کردیتا ہے تو یہ روسی صدر کے لیے اچھا فیصلہ نہ ہوگا جب کہ انھیں صرف ۷ سال کا عرصہ درکار ہے، اسٹالن کے تیس سالہ دورِ اقتدار کا ریکارڈ توڑنے میں۔ صدر پوٹن کے لیے آپشنز دن بدن کم ہوتے جا رہے ہیں اس آخری آپشن کے طور پر وہ ایٹمی ہتھیاروں کا بھی استعمال کرسکتے ہیں جس کی وہ بار بار دھمکیاں دے رہے ہیں۔

گر پیوٹن کو ناقابلِ تصور حد تک بڑھنے سے پہلے کھیل سے باہر کردینا ہے تو یقینی طور پر اس کام کو پورا کرنے کے لیے ان کے اپنے فوجی یا خفیہ ایجنسی کے افراد کی ضرورت ہوگی۔ جیسے جیسے یوکرین میں جنگ بڑھتی جارہی ہے اور بین الاقوامی ذرائع ابلاغ روسی مظالم اور شہری ہلاکتوں کی رپورٹیں دے رہا ہے، دنیا ماسکو کی طرف متوجہ ہورہی ہے۔ اگرچہ پیوٹن نے یہ جنگ اس کے تدارک کے لیے شروع کی ہوگی کہ وہ سوویت یونین کو دوبارہ بحال کریں گے، تاہم اس خیال نے خطے کو ایک تباہ کن جنگ کی جانب دھکیل دیا ہے اور ساتھ ساتھ انھوں نے اپنے مستقبل کو بھی خطرات میں ڈال لیا ہے۔ (ترجمہ: حافظ محمد نوید نون)

"Putin’s Afghanistan: Ukraine and the lessons of the Soviets’ Afghan war".
("Foreign Affairs". March 24, 2022)

بھارت سے کشمیر کے الحاق کی سازشیں

محمد شعیب

بھارت کی حکومت کشمیری پنڈتوں کے خاندان کا بہت خیال رکھتی ہے اور ان کی ان تمام ضروریات کو پورا کرتی ہے جو انہیں کشمیر میں ان کے آبائی مقامات پر لوٹنے میں مدد فراہم کریں، کشمیری پنڈتوں کے یہ خاندان ۸۰ اور ۹۰ کے عشرے میں کشمیر میں دوبارہ بسائے گئے اس بارے میں کئی نظریات نے جنم لیا کہ آخر بھارت اس سارے ڈرامے سے کیا حاصل کرنا چاہتا ہے اور کیا یہ آزادی کی جدوجہد نہیں تھی، کشمیری پنڈتوں کی کشمیر میں واپسی بھارت کی پالیسی ہے جس کے ذریعے وہ چاہتا ہے کہ کشمیر میں مسلمانوں کی نسلی آبادی کو متاثر کیا جاسکے اس کے لیے بھارت اپنے تمام وسائل، تمام ذہانت اور تمام توانائی کو استعمال کررہا ہے کہ کس طرح کشمیر پر جابرانہ قبضہ برقرار رکھا جاسکے، لیکن بھارت اپنی کوشش میں اب تک ناکام ہے اور کشمیر میں مسلمانوں کی نسلی آبادی ابھی بھی قائم ہے اور اپنے وجود پر بضد ہے۔

بھارت کے سرکاری اعداد و شمار کے مطابق ۳۸۰۰ کشمیری پنڈتوں کے گھر دوبارہ بحال کیے گئے ہیں، ۴۴ ہزار کشمیری پنڈتوں کو ۱۳ ہزار بھارتی روپے ماہانہ یا ۱۳۰۰ ڈالر ہر مہینے ادا کیے گئے، ۶ ہزار میں ۳ ہزار آٹھ سو ملازمتیں ان پنڈتوں کو مہیا کی گئیں، جبکہ گجرات میں فسادات کے بعد مسلمانوں کو محض ۵۰۰ روپے دیے گئے جو کہ فوراً واپس لے لیے گئے اور انہیں زبردستی ان کے گھروں سے بے دخل کردیا گیا۔ یہ کوئی پہلا واقعہ نہیں بلکہ اس جیسے اَن گنت واقعات ہیں جو یہ ظاہر کرتے ہیں کہ بھارت میں مسلمانوں کو دوسرے درجے کے شہری کے طور پر دیکھا اور برتا جاتا ہے۔

فروری ۱۹۸۶ء میں انت ناگ فسادات سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ کسی ہندو کو نقصان نہیں پہنچا لیکن لاتعداد ہندو گھروں کو تباہ کیا گیا، تحقیقات سے یہ ثابت ہوا ہے کہ انت ناگ فسادات مسلمانوں کی سازش نہیں تھی بلکہ بھارتی حکومت نے یہ فسادات خود کروائے تھے۔ رپورٹ کے مطابق بھارت نے اپنی طرف توجہ مبذول کروانے کے لیے مذہبی جذبات کا استحصال کیا ہے۔

جموں اور کشمیر کے سرکاری اعداد و شمار کے مطابق تقریباً ۶۰ ہزار خاندان جموں و کشمیر سے دوسرے خطے یا دوسرے پڑوسی ممالک کی طرف ہجرت کرچکے ہیں، وادی سے نکلنے کے بعد انہیں مختلف ممالک میں انجینئرنگ اور میڈیکل جیسے پیشوں میں جانے کا موقع ملا، یہ سب کچھ کشمیر میں برسوں سے جاری ہے، کسی بھی طالب علم کو بھارت سے باہر پڑھانے کے لیے ۵۰ ملین انڈین روپے سے زیادہ کی ضرورت ہوتی ہے، بھارت کی سیاسی کشمکش اور قتل کے واقعات سے یہ بات محسوس کی گئی ہے کشمیریوں کا قتل سیاسی طور کیا جارہا ہے۔

کشمیری پنڈتوں کا وادیٔ کشمیر سے فرار ایک متنازع موضوع ہے، دوسرے حصوں میں زندگی گزارنے والے کشمیری پنڈت یہ کہتے ہیں کہ ۱۹۸۹ء میں مقبوضہ جموں و کشمیر میں ہونی والی بغاوت کے بارے میں یہ کہا جاتا ہے کہ سیکڑوں پنڈتوں کو وادی سے جلاوطن کیا گیا ان کی نسل کشی کی گئی اور انہیں وادی چھوڑنے یا پھر فرار ہونے پر مجبور کیا گیا لیکن اس وقت وادی میں رہائش پذیر پنڈتوں کی رائے مختلف ہے۔

بہت سے علما کا خیال ہے کہ ملک میں ہندو مسلم فسادات کی ذمہ دار بھارت کی حکومت ہے، یہی صورتحال کشمیر میں اس وقت پیدا ہوئی جب بھارتی فوج کے کشمیر میں داخلے کے خلاف مزاحمت کرنے والے کشمیری نوجوان میدان میں آئے، کشمیری پنڈتوں کے افسانے کو بھارتی حکومت نے جواز بناتے ہوئے مسلمانوں پر بڑے پیمانے پر ظلم کرنے کے لیے استعمال کیا۔

بھارتی حکومت نے کشمیری پنڈتوں کے چلے جانے کا فائدہ اٹھایا اور اوراسے بین الاقوامی برادری کے سامنے شیلڈ کے طور پر استعمال کیا اور ان کی حمایت حاصل کی۔ بھارتی حکومت اب کشمیر میں پنڈتوں کے خاندانوں کی مدد کررہی ہے انہیں کشمیر میں واپسی کے قابل بنارہی ہے، پنڈت خاندانوں کی زیادہ سے زیادہ تعداد کے ذریعے بھارتی حکومت کشمیر کے اکثریتی مذہب کو تبدیل کرنا چاہتی ہے اور ساتھ ساتھ وہ جغرافیائی حدود کو بھی تبدیل کرنا چاہتی ہے۔

آرٹیکل ۳۷۰ اور ۳۵۔اے جس کے تحت کشمیر کی ایک منفرد حیثیت تھی بھارتی حکومت نے اسے منسوخ کردیا ہے نتیجے کے طور پر بھارت نے جغرافیائی حدود کو تبدیل کردیا اور یہ بین الاقوامی قوانین کی کھلی خلاف ورزی ہے۔ ۷۵ برسوں سے بھارت کشمیریوں کو حق خودارادیت دینے کو تیار نہیں ہے اس صورتحال نے کشمیر کو ایک مسلم اکثریتی خطہ ثابت کیا ہے کشمیر میں موجود ہر شخص بھارتی حکومت کی ہر مجرمانہ سرگرمی کو انتہائی سنجیدگی سے لیتا ہے۔ (ترجمہ: سمیہ اختر)

"Indian government’s hybrid tactics for Kashmiris".
("globalvillagespace.com". April 22, 2022)

تیونس میں مطلق العنانیت کا پھیلاؤ

Shadi Hamid and Sharan Grewal

تیونس میں اقتدار پر گرفت زیادہ سے زیادہ مضبوط بنانے کے لیے شروع کی جانے والی بغاوت کے آغاز کو اب نو ماہ گزر چکے ہیں۔ کچھ مدت پہلے تک تیونس ایک ایسا ملک ہوا کرتا تھا کہ جو مشرقِ وسطیٰ میں جمہوری اقدار کے فروغ کے حوالے سے غیر معمولی طور پر پُر امید ہونے کا موقع فراہم کرتا تھا۔ جولائی میں پارلیمان کو ٹینکوں کی مدد سے بند کرنے کے بعد صدر قیس سعید نے آئین معطل کیا اور سپریم جوڈیشل کونسل کو ختم کر دیا۔ اس کے بعد شاید اب تک کے سب سے پریشان کن اقدام کے طور پر صدر قیس سعید نے خود مختار الیکشن کمیشن کا کنٹرول بھی سنبھال لیا ہے۔ ایک اہم سوال یہ ہے کہ اقتدار پر گرفت کرنے کے سست رفتار عمل کو کس مقام تک جانے دیا جائے کہ جہاں معاملات کو پلٹنا ممکن ہی نہ رہے۔

یوکرین پر روس کی لشکر کشی کو پوری دنیا نے انتہائی الجھن کے ساتھ دیکھا اور جھیلا ہے۔ امریکا کے صدر جوزف بائیڈن نے روس کے ساتھ امریکا کی جدوجہد کو نظریاتی قرار دیا ہے اور کہا ہے کہ امریکا دنیا بھر میں جمہوریت کی بقا کی جنگ لڑ رہا ہے جبکہ روس جیسے ممالک مطلق العنانیت کی راہ ہموار کرنے پر تُلے ہوئے ہیں۔ کچھ مدت سے مشرقِ وسطیٰ کو اس حوالے سے مکمل طور پر نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ پھر بھی تیونس کا حالیہ بحران جمہوری اقدار کو مضبوط کرنے کے حوالے سے بہت کچھ کرنے کی دعوت دے رہا ہے۔ تیونس میں جمہوریت کے پنپنے اور خطے کے دیگر ممالک کو بھی کچھ نہ کچھ کرنے کی تحریک دینے کی گنجائش تھی۔ یہ گنجائش اب دم توڑ چکی ہے۔ ایسے میں عالمی برادری کو آگے بڑھ کر کچھ کرنا ہے۔

امریکی حکام اب تک صدر قیس سعید پر زیادہ دباؤ ڈالنے کے حوالے سے خاصی ہچکچاہٹ کا شکار رہے ہیں۔ انہوں نے جولائی کے معاملات کو صدر قیس سعید کی مقبولیت سے تعبیر کیا تھا۔ تیونس میں بہت سے لوگ سیاسی جماعتوں کی آپس کی لڑائی سے بیزار ہو چکے تھے اور اُنہیں پارلیمنٹ سے بھی کچھ امید نہیں تھی جو معیشت کو سنبھالا دینے اور جمہوریت کا فروغ یقینی بنانے میں بہت حد تک ناکام رہی تھی۔ قیس سعید آئینی امور کے پروفیسر ہیں۔ انہوں نے عہد کیا کہ وہ سیاسی اشرافیہ کو بائی پاس کرتے ہوئے کسی نہ کسی طور نتائج دیں گے۔ اُن کا خیال تھا کہ صرف وہی تیونس کے مسائل حل کر سکتے ہیں۔

صدر قیس سعید کچھ کرنے میں ناکام رہے ہیں۔ اگر اُن کے حوالے سے تمام معاملات پر غور کرتے ہوئے بہت کچھ نئے سرے سے کرنے کا وقت ہے تو یہی ہے۔ اگر اس معاملے میں دیر کی گئی تو قیس سعید اقتدار پر مکمل قبضہ کر کے جمہوریت کو ختم ہی کر دیں گے۔ مشرقِ وسطیٰ میں بہت سے مقامات پر دیکھ چکے ہیں اور ۲۰۱۳ء کی مصر کی فوجی بغاوت بھی ایک مثال ہے کہ جب کوئی نئی حکومت قائم ہوتی ہے تو عالمی برادری کے پاس کچھ کرنے کا آپشن برائے نام رہ جاتا ہے۔

امریکا نے اب تک محض یہ سوچتے ہوئے اچھا خاصا وقت ضایع کیا ہے کہ نجی طور پر کی جانے والی چند ایک کوششوں سے قیس سعید کو راہِ راست پر لانا ممکن ہو سکے گا۔ ایسا کچھ بھی ہوتا دکھائی نہیں دیا ہے۔ مطلق العنان حکمرانوں کو اپنے ملک اور عوام کے لیے کچھ کرنے اور جمہوریت کو فروغ دینے کے حوالے سے کچھ کرنے کی تحریک دینے کی کوششوں کے کامیاب ہونے کی ضمانت نہیں دی جاسکتی۔ دوسرے بہت سے مطلق العنان حکمرانوں کی طرح قیس سعید بھی نمائندہ جمہوریت پر ذرا یقین نہیں رکھتے۔ انہوں نے ۲۰۱۹ء میں دعویٰ کیا تھا کہ جمہوریت دیوالیہ ہو چکی ہے اور اب اُس کا دور لد چکا ہے۔ محض مکالمے سے اُن کا ذہن تبدیل کرنے کے حوالے سے زیادہ امید وابستہ نہیں کی جاسکتی۔

اب بائیڈن انتظامیہ کو یقین ہوتا جا رہا ہے کہ جب تک چند ایک فیصلہ کن اقدامات نہ کیے جائیں گے تب تک محض بڑھکیں مارنے سے کچھ بھی حاصل نہ ہوگا۔ مارچ کے آخر میں امریکی محکمۂ خارجہ نے تجویز پیش کی کہ تیونس کی حکومت پر جمہوریت کے فروغ اور عوام کے مسائل کے حل کے حوالے سے دباؤ بڑھانے کے لیے اس کی فوجی اور معاشی امداد مرحلہ وار کم کر کے نصف سطح پر لائی جائے۔ وزیر خارجہ انٹونی بلنکن نے یہاں تک کہا کہ صدر قیس سعید کی طرف سے شفافیت یقینی بنائے جانے اور سیاسی جماعتوں، محنت کش طبقے اور سول سوسائٹی کے حوالے سے اصلاحات یقینی بنائے جانے تک تیونس کی کسی بھی طرح کی امداد بحال نہیں کی جائے گی۔

یہ اچھا آغاز ہے تاہم محدود ہے۔ اس نوعیت کے اقدامات سے قیس سعید پر زیادہ دباؤ نہیں پڑے گا اور وہ اپنی طرزِ حکمرانی تبدیل کرنے کی طرف مائل نہیں ہوں گے۔ امریکا کو کھل کر بیان کر دینا چاہیے کہ اگر صدر قیس سعید نے معاملات درست نہ کیے تو تیونس کی ہر طرح کی امداد مکمل طور پر بند کر دی جائے گی۔ اس سلسلے میں امریکا چاہے تو یورپی یونین کے ساتھ مل کر بھی بہت کچھ کر سکتا ہے۔

صدر قیس سعید ایک سال سے بھی زائد مدت سے بین الاقوامی مالیاتی فنڈ سے کئی ارب ڈالر کے ایک پیکیج کے لیے مذاکرات کرتے آئے ہیں تاکہ تیونس کو دیوالیہ ہونے سے بچایا جاسکے۔ اس طرح کے کسی بھی پیکیج سے قبل تیونس کی حکومت کو پابند کیا جائے کہ وہ سیاسی، معاشی اور انتخابی اصلاحات یقینی بنائے۔ تیونس میں بھی سبسڈیز کا مسئلہ سنگین شکل اختیار کر چکا ہے۔ سرکاری شعبے کی تنخواہوں کا بل بہت زیادہ ہے۔ سرکاری شعبے کے بیشتر ادارے خسارے میں چل رہے ہیں۔ یہ سارا بوجھ عوام کو برداشت کرنا پڑ رہا ہے۔ ان تمام معاملات کو خالص سیاسی مذاکرات کے ذریعے طے کرنے کا وقت آچکا ہے۔ صدر قیس سعید کو تمام سیاسی جماعتوں سے مذاکرات کر کے ملک کو سیدھی راہ پر ڈالنے کے حوالے سے روڈ میپ تیار کرنا چاہیے۔ اسی طور ملک کو دوبارہ جمہوریت کی راہ پر گامزن کیا جاسکے گا۔ جمہوری اقدار کو پروان چڑھانے کے لیے لازم ہے کہ بڑی اور نمائندہ سیاسی جماعتوں کو وسیع البنیاد مکالمے کا حصہ بنایا جائے۔

یہ بات واضح ہو جانی چاہیے کہ آئی ایم ایف اس طور کام نہیں کرتا۔ اس کے قواعد وضوابط میں خصوصی سیاسی حالات کا کوئی ذکر نہیں۔ پھر بھی امریکا اور یورپی یونین مل کر آئی ایم ایف کے سب سے بڑے شیئر ہولڈر کے طور پر اس بات کو یقینی بناسکتے ہیں کہ آئی ایم ایف کے حکام تیونس میں سیاسی اصلاحات یقینی بنانے پر بھی زور دیں اور اس حوالے سے تیونس کی مطلق العنان حکومت پر دباؤ بڑھائیں۔

ہوسکتا ہے کہ صدر قیس سعید کو راہ بدلنے پر مجبور کرنے کا یہی بہترین اور آخری طریقہ ہو۔ تیونس کی معیشت لڑھکتی جارہی ہے۔ ایسے میں تیونس چاہے گا کہ اُس کے مغربی شراکت دار آگے بڑھ کر کچھ کریں۔ تیونس کے ایک سابق سینئر افسر نے حال ہی میں بتایا کہ قیس سعید آئی ایم ایف کے بغیر نہیں چل سکتے۔ تیونس کو محض اپنے مسائل حل کرنے کے لیے ہی آئی ایم ایف کا پیکیج درکار نہیں بلکہ اس پیکیج ہی کی

باقی صفحہ نمبر ۹

ہندو قوم پرستی کی سفاک لہر

Hartosh Singh Bal

اس وقت بھارت میں انتہائی دائیں بازو کے ہندو عناصر محض ذاتوں ہی کو نہیں بلکہ خود ملک کو بھی مسخر کر رہے ہیں۔ یہ صورتِ حال اقلیتوں کے لیے انتہائی خطرناک اور تشویشناک ہے۔ ہرتوش سنگھ بال نئی دہلی کے جریدے ”کاروان“ کے مدیر اور ”واٹرز کلوز اوور اَس: اے جرنی الانگ دی نرمدا“ کے مصنف ہیں۔ اس مضمون میں ہرتوش سنگھ بال نے بھارت کو درپیش سب سے بڑے سیاسی اور معاشرتی چیلنج کا تجزیہ کیا ہے۔

۲۵ مارچ ۲۰۲۲ء کو بھارتیہ جنتا پارٹی کے یوگی آدتیہ ناتھ نے بھارت کی سب سے بڑی ریاست اتر پردیش کے وزیرِ اعلیٰ کی حیثیت سے دوسری مدت کے لیے حلف اٹھایا۔ اس موقع پر پوری ریاست کے مندروں میں دو گھنٹے تک گھنٹیاں بجائی جاتی رہیں۔ یہ اہتمام یوگی آدتیہ ناتھ کی امیج سے مطابقت پیدا کرنے کے لیے تھا جو بھارتی وزیرِ اعظم نریندر مودی کے دستِ راست سمجھے جاتے ہیں اور جن کا بنیادی ایجنڈا بھارت کو ایک ہندو ریاست میں تبدیل کرنے کا ہے۔

یوگی آدتیہ ناتھ کی کامیابی غیر معمولی ہے۔ وہ تیس سال میں دوسرے وزیرِ اعلیٰ ہیں جنہوں نے دوسری مدت کے لیے منصب سنبھالا ہے۔ کورونا کی وبا سے نمٹنے میں واضح ناکامی کے باوجود عوام نے اُنہیں دوبارہ منتخب کیا۔ اتر پردیش میں کورونا سے مرنے والوں کی تعداد بہت زیادہ تھی۔ بیشتر اموات کی تو رپورٹنگ ہی نہیں ہوئی۔ دریائے گنگا میں دور تک لاشیں بہتی ہوئی پائی گئیں۔ کورونا کی وبا کے دوران مریض اسپتالوں میں بستروں اور آکسیجن کے لیے ترستے رہے۔ بہر حال اتر پردیش اسمبلی کی ۴۰۳ نشستوں میں سے ۲۵۵ بھارتیہ جنتا پارٹی نے جیت لیں جو اس کی اپنی توقعات سے کہیں بڑی کامیابی ہے۔

اتر پردیش بھارت کی سب سے بڑی ریاست ہے جس کی آبادی ۲۰ کروڑ سے زائد ہے۔ بھارتی پارلیمان کی ۵۴۳ نشستوں میں اتر پردیش کا حصہ ۸۰ ہے۔ ۲۰۱۷ء میں اتر پردیش اسمبلی کے انتخابات میں بھارتیہ جنتا پارٹی کی شاندار کامیابی کے بعد یوگی آدتیہ ناتھ کو وزیرِ اعلیٰ کی حیثیت سے منتخب کیا گیا تھا تب بھی سیاسی مبصرین کو بہت حیرت ہوئی تھی۔ یوگی آدتیہ ناتھ ایک بڑے ہندو مذہبی ادارے کے سربراہ تھے اور اُن پر مسلمانوں کو دھمکانے کا الزام بھی تھا۔ یوگی آدتیہ ناتھ نے مسلمانوں کو دو ٹانگوں والے جانور قرار دیتے ہوئے اس بات پر زور دیا تھا کہ اُن کی آبادی میں اضافہ روکا جائے۔ یہ بات بھارتیہ جنتا پارٹی کی پالیسی سے ہٹ کر تھی جو اس وقت صرف معاشی ترقی کی بات کر رہی تھی۔

بعد میں معلوم ہوا کہ یوگی آدتیہ ناتھ جو کچھ کہہ رہے تھے وہی تو مرکزی حکومت کا ایجنڈا تھا اور یہ سب کچھ نریندر مودی کی سوچ کے مطابق تھا۔ ۲۰۱۹ء میں بی جے پی کی مرکزی حکومت نے شہریت کا ایک ایسا قانون منظور کیا جس کے تحت مسلمانوں اور مسیحیوں کو بھارتی سرزمین سے تعلق رکھنے والے مذاہب (ہندو ازم، سکھ ازم، بدھ ازم) کے پیروؤں سے الگ رکھ کر دیکھا گیا۔ اس قانون کے تحت لاکھوں افراد کو بھارتی شہریت کے حق سے محروم کرنے کی تیاری کی گئی جس کے خلاف ملک گیر احتجاج کیا گیا۔ اتر پردیش حکومت نے اس حوالے سے کیے جانے والے احتجاج کا سخت جواب دیتے ہوئے مظاہرین کی املاک ضبط کرنے سے بھی گریز کیا، گوکہ سپریم کورٹ نے ایسا کرنے پر پابندی عائد کی۔ جب سے مودی نے اقتدار سنبھالا ہے، بھارت بھر میں مسلمانوں پر حملے بڑھ گئے ہیں۔ حال ہی میں ایک ہندو تہوار کے موقع پر تصادم کے نتیجے میں صورتِ حال مزید نازک ہوگئی ہے۔ اتر پردیش میں صورتِ حال زیادہ خراب ہے کیونکہ وہاں یوگی آدتیہ ناتھ نے امن برقرار رکھنے کے نام پر ایک ایسی مہم شروع کی ہے جس کا بنیادی مقصد مسلمانوں کو قتل کرنا ہے۔

بہت سے تجزیہ کاروں کا کہنا ہے کہ کورونا کی وبا کے دوران غریبوں میں خوراک اور نقد امداد تقسیم کرنے کی پالیسی نے یوگی آدتیہ ناتھ کو دوبارہ اتر پردیش کا وزیرِ اعلیٰ بنانے میں کلیدی کردار ادا کیا ہے۔ یہ تجزیہ ایسا نہیں کہ آسانی سے ہضم ہو جائے۔ اتر پردیش کے بہت سے اور بالخصوص دور افتادہ علاقوں میں کورونا لاک ڈاؤن کے دوران صورتِ حال بہت خراب رہی۔ اتر پردیش میں بی جے پی کی انتخابی فتح دراصل بہت سے دوسرے عوامل کا نتیجہ ہے۔ نریندر مودی کو پہلی بار اقتدار ۲۰۱۴ء میں ملا۔ بی جے پی نے بعض ایسی ریاستوں میں بھی کامیابی حاصل کی جہاں اُس کی کامیابی کا امکان نہ تھا۔ پھر ۲۰۱۹ء کے عام انتخابات میں بھی بی جے پی پھر ابھر کر سامنے آئی۔ اس کے نتیجے میں ریاستی اسمبلیوں کے انتخابات میں بھی بی جے پی کی فتح کی راہ مزید ہموار ہوگئی۔ فروری اور مارچ ۲۰۲۲ء میں ۶ ریاستی اسمبلیوں کے انتخابات ہوئے جن میں سے ۵ میں بی جے پی کامیاب رہی ہے۔

بی جے پی کی کامیابی کا راز معیشت سے کہیں ہٹ کر وسیع تر اور تاریک تر ہے۔ برسوں تک ہندو انتہا پسندوں نے ملک کے مختلف حصوں میں ایک منظم اور مربوط سیاسی ایجنڈے کے تحت کام کیا ہے تاکہ بھرپور اجتماعی نتائج یقینی بنائے جاسکیں۔ اعلیٰ ذات کے ہندو سیاسی حفظِ مراتب میں سب سے اوپر ہیں اور بی جے پی اُنہیں خوش کرنے میں کامیاب رہی ہے۔ بی جے پی نے نچلی سطح پر نچلی ذات کے ہندوؤں کو بھی نمائندگی دے کر اُن کی حمایت حاصل کرنے میں کامیابی حاصل کی ہے۔ بی جے پی نے اسلاموفوبیا کو بخوبی استعمال کرتے ہوئے بھارت کے ۹۶ کروڑ ہندوؤں کو مسلمانوں سے مزید متنفر کرنے اور اُنہیں خوف کی نظر سے دیکھنے پر مائل کرنے میں کامیابی حاصل کی ہے۔ دوسری طرف ملک کے ۲۰ کروڑ مسلمانوں پر عرصۂ حیات تنگ کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی گئی۔

اس صورتِ حال نے بھارتی معاشرے کو مزید تقسیم کی طرف دھکیل دیا ہے۔ جن ریاستوں میں ہندو فیصلہ کن تعداد میں نہیں وہاں بے چینی بڑھی ہے۔ کشمیر اور دیگر سرحدی ریاستوں میں مسلمانوں کے جذبات زیادہ مجروح ہوئے ہیں۔ بی جے پی کی سیاسی قوت میں اضافے سے ایک طرف مسلمانوں کو دبوچنے کے عمل میں شدت آئے گی اور جن ریاستوں میں بی جے پی کی حکومت نہیں بنائی جاسکی وہاں معاملات کو مزید سختی سے نمٹایا جائے گا۔

۱۹۲۵ء میں شمالی بھارت کے ڈاکٹر کیشو بلی رام ہیڈگیوار نے انتہائی دائیں بازو کی عسکریت پسند رجحانات کی حامل، تنظیم راشٹریہ سویم سیوک سنگھ (آر ایس ایس) کی بنیاد رکھی۔ اس تنظیم کے قیام کا بنیادی مقصد ملک بھر میں ہندو ازم کو ایک منظم مذہب کی شکل دینا تھا۔ آر ایس ایس کی بنیاد رکھنے والوں نے یورپ کے فاشسٹ حکمرانوں سے تحریک پائی تھی۔ اس تنظیم نے ابتدا ہی سے مسلمانوں اور مسیحیوں کو شک اور نفرت

کی نظر سے دیکھا ہے۔ ۱۹۴۰ء سے ۱۹۷۳ء تک آر ایس ایس کو چلانے والے مادھو سداشیو گولوالکر نے مسلمانوں سے نمٹنے کے معاملے میں جرمن ڈکٹیٹر ایڈولف ہٹلر کا ''آخری حل'' کا طریقہ استعمال کرنے کی ترغیب دی۔ یعنی جس طور ہٹلر نے یہودیوں کا قتلِ عام کیا تھا بالکل اُسی طور مسلمانوں کا بھی قتلِ عام کیا جائے۔

۱۹۴۸ء میں جب آر ایس ایس کے سرگرم کارکن نتھو رام گوڈسے نے بھارت کے بابائے قوم موہن داس کرم چند گاندھی کو قتل کر دیا جب حکومت نے اس تنظیم پر کچھ مدت کے لیے پابندی عائد کی۔ بعد ازاں جب اس تنظیم کے قائدین نے مسلمانوں کو ہراساں کرنے کے محتاط طریقے اپنائے تب اس تنظیم کی مقبولیت میں غیر معمولی تیزی سے اضافہ ہوا۔ ۱۹۸۰ء میں آر ایس ایس نے سیاسی عزائم کی تکمیل کے لیے بی جے پی کی بنیاد رکھی۔ ۱۹۸۳ء میں ایودھیا (اتر پردیش) میں واقع بابری مسجد کو ختم کرنے کی تحریک شروع کی گئی۔ بابری مسجد کو ختم کر کے وہاں رام جنم بھومی مندر کی تعمیر کے نام پر بی جے پی نے غیر معمولی سیاسی کامیابی حاصل کی اور اقتدار تک پہنچنے میں کامیاب رہی۔ بی جے پی نے پہلی بار ۱۹۹۱ء میں اتر پردیش اسمبلی کا الیکشن جیتا۔ صرف ایک سال بعد پارٹی کی قیادت اور پولیس نے ساتھ ساتھ کھڑے ہو کر بابری مسجد کے انہدام کا تماشا دیکھا۔ ہندو انتہا پسندوں کو روکنے کی برائے نام کوشش بھی نہیں کی گئی۔ بابری مسجد کو غیر قانونی طور پر منہدم کرنے کے عمل کی قیادت بی جے پی کے قائدین نے کی۔

بھارت میں برہمن (مذہبی قائدین)، شتریہ (جنگجو) اور ویشیہ (تاجر) تینوں اعلیٰ ذاتیں کہلاتی ہیں۔ ان تینوں ذاتوں سے تعلق رکھنے والے ہندوؤں کی تعداد ہندوؤں کی مجموعی تعداد کا محض ۱۵ فیصد ہے مگر پھر بھی یہ تمام معاملات پر متصرف ہیں۔ بی جے پی نے ان تینوں اعلیٰ ذاتوں کی حمایت حاصل کرنے میں کامیاب رہی۔ مسلمانوں اور دیگر اقلیتوں کے خلاف غیر معمولی مخاصمانہ رویہ رکھے جانے پر بھی بی جے پی کی مقبولیت ان تینوں ذاتوں سے تعلق رکھنے والوں میں گھٹی نہیں۔ بی جے پی کا ایجنڈا تینوں اعلیٰ ذات والوں کے لیے انتہائی پُرکشش تھا کیونکہ یہ تینوں بھی ہندوازم کی برتری کی بات کرتے ہیں جبکہ بی جے پی نے ہندوازم کی برتری ہی کو بنیادی ایجنڈا بنایا تھا۔ ملک بھر کے مالیاتی اور علمی مآخذ پر تینوں اعلیٰ ذاتوں کا تصرف ہے۔ بی جے پی کے ساتھ مل کر کام کرنا ان تینوں کے لیے بالکل فائدے کا سودا تھا۔ تینوں اعلیٰ ذاتوں کو بی جے پی اس لیے بھی پسند آئی کہ نچلی ذات کے ہندوؤں کی بھرپور حمایت کی مدد سے بڑھ چڑھ کر کام کرنے والی متعدد سیاسی جماعتوں کے لیے بی جے پی ایک بڑی رکاوٹ بن کر نمودار ہوئی تھی۔

آر ایس ایس نے نچلی ذات کے ہندوؤں میں مقبولیت بڑھانے پر بھی توجہ دی۔ وہ اس بڑے ووٹ بینک کو کسی بھی حال میں نظر انداز نہیں کر سکتی تھی۔ بہت سی سیاسی جماعتیں اور گروپ نچلی ذات کے ہندوؤں (دلتوں) کو اپنے ساتھ رکھنے میں کامیاب رہے تھے۔ یہ بات آر ایس ایس سے ہضم نہ ہو پائی۔ بی جے پی کسی نہ کسی طور نچلی ذات کے ہندوؤں میں بھی جگہ بنانے میں کامیاب رہی ہے۔

بھارت میں جو لوگ براہمنی ہندوازم سے باہر ہیں وہ بھی بی جے پی کے دائرے میں رہنا پسند کرتے ہیں۔ بھارت بھر میں آدی واسی (قدیم، قبائلی باشندے) ۵۷ کروڑ ہیں۔ یہ لوگ بنیادی طور پر ہندوازم کے دائرے سے باہر ہیں مگر بی جے پی ان میں جڑیں گہری کرنے میں کامیاب رہی ہے۔ اس کا سہرا آر ایس ایس کے سر ہے جس نے ملک بھر کے آدی واسی علاقوں میں اسکول کھولے اور جہاں تک ہندوازم کی بات نہیں گئی تھی وہاں تک پہنچائی۔ آدی واسیوں کے دیوی دیوتا الگ ہیں مگر آر ایس ایس نے ان دیویوں اور دیوتاؤں کو ہندوازم کے دائرے میں لانے اور ہندو دیو مالا کا حصہ بنانے میں گہری دلچسپی لی ہے۔ آر ایس ایس آدی واسیوں کو اس نام سے پکارنے سے گریز کرتا ہے اور اُنہیں ''ون واسی'' (جنگل کے باشندے) کہنے کے ساتھ ساتھ پورے زور و شور سے یہ دعویٰ بھی کرتا ہے کہ بھارت کے اولین باشندے ہندو تھے۔

آج آر ایس ایس کے ارکان کی تعداد لاکھوں میں ہے اور یہ شاید دنیا کی سب سے بڑی غیر سرکاری تنظیم ہے۔ اور اس کی طاقت سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا۔ مزدور انجمنوں سمیت بہت سی تنظیموں، تحریکوں اور مہمات میں آر ایس ایس گھسی اور گندھی ہوئی ہے۔ آر ایس ایس کے طلبہ، اساتذہ، خواتین اور وکلا ونگ بھی ہیں۔ آج بی جے پی کی سالانہ آمدن اس کی سب سے بڑی حریف جماعت کی سالانہ آمدن سے پانچ گنا ہے اور میڈیا میں بھی اس کی جڑیں بہت گہری ہیں۔ یہ بات حیرت انگیز نہیں کیونکہ پریس پر اعلیٰ ذات والوں کا تصرف ہے اور بی جے پی کا ایجنڈا اعلیٰ ذات کے ہندوؤں کے لیے زیادہ موزوں ہے۔

اتنی مدت گزر جانے پر بھی آر ایس ایس کا نظریہ نہیں بدلا۔ وہ اب بھی اس نکتے پر زور دیتی ہے کہ بھارتی سرزمین پر بسنے والوں کو یہ ماننا چاہیے کہ یہ محض مادرِ وطن نہیں بلکہ مقدس ترین سرزمین ہے اور یہ کہ مسلم اور مسیحی مختلف لوگ ہیں جن کی مقدس سرزمین کہیں اور ہے۔ آر ایس ایس پر ملک کے مختلف حصوں میں مسلمانوں اور مسیحیوں پر حملوں کا الزام عائد کیا جاتا رہا ہے۔ ۲۰۰۲ء میں آر ایس ایس نے گجرات میں مسلمانوں کا قتلِ عام کیا۔ تب نریندر مودی گجرات کے وزیرِ اعلیٰ تھے۔

المیہ یہ ہے کہ تشدد اور قتلِ عام نے آر ایس ایس اور بی جے پی دونوں ہی کو مزید مضبوط بنایا ہے۔ گجرات کے مسلم کش فسادات کی لہر پر سوار ہو کر نریندر مودی نے بھرپور انتخابی کامیابی حاصل کی۔ بے شرمی اور بے غیرتی کی حد یہ ہے کہ گجرات کے مسلم کش فسادات میں متاثر ہونے والے مسلمانوں کے لیے لگائے گئے ریلیف کیمپوں کو نریندر مودی نے بچے پیدا کرنے والی فیکٹریاں قرار دیا! بعد میں انہوں نے مرکز میں دوبارہ انتخابات بنگلادیش سے مسلمانوں کی دراندازی کا ہوّا کھڑا کر کے جیتے۔ نریندر مودی نے اتر پردیش میں دوبارہ الیکشن جیتنے کے لیے یوگی آدتیہ ناتھ ہی کو چُنا جنہوں نے ۸۰ فیصد (ہندو) بمقابلہ ۲۰ فیصد (مسلم) کا نعرہ لگایا۔ یہی نعرہ مرکز میں بھی کام آسکتا ہے۔ ملک بھر میں کم و بیش یہی تو صورتِ حال ہے یعنی ہندو ۸۰ فیصد ہیں۔ یوں معاشرے کو مذہب کی بنیاد پر مزید تقسیم کر کے انتخابی فتح یقینی بنانا کچھ دشوار نہیں۔ بات سیدھی سی ہے، بی جے پی کے لیے یہ بتانا بہت مشکل ہے کہ مودی اور آدتیہ ناتھ اب تک اقتدار میں کیوں ہیں۔ اُن کے پاس مسلم دشمنی کے سوا کوئی آپشن ہے ہی نہیں۔ اس حقیقت سے بھی کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ جب سے مودی کو اقتدار ملا ہے، بھارتی معیشت کے فروغ پانے کی رفتار سست ہوئی ہے اور عالمی برادری میں بھارت کو نظریات اور تہذیب کے محاذ پر بھی خسارے کا سامنا رہا ہے۔

چین نے بھارت کو سرحدوں پر دبوچنے کا عمل جاری رکھا ہے۔ بھارت کا مدار اب تک روس کے ایسے اسلحے پر ہے جو از کار رفتہ ہے۔ نریندر مودی دعویٰ تو بہت کرتے ہیں کہ بھارت کو خود انحصاری والا ملک ہونا چاہیے مگر یہ بات کہنے کی حد تک ہی پُرکشش ہے۔ یوکرین کے معاملے میں بھارت کی کمزوری ثابت ہو چکی ہے۔ وہ عالمی برادری کو یہ یقین دلانے میں ناکام رہا ہے کہ وہ یوکرین کے ساتھ اور روس کے مقابل ہے۔ مودی کی طرح یوگی آدتیہ ناتھ بھی اپنے حصے کا کام کرنے میں ناکام رہے ہیں۔ انہوں نے کورونا کی وبا کے

دوران معاملات کو بھونڈے طریقے سے چلایا اور معیشتی نمو کے حوالے سے بھی وہ کمزور رہے ہیں۔

خیر، مودی اور آدتیہ ناتھ کے دیوانوں کے لیے یہ تمام ایشو بے معنی ہیں۔ آر ایس ایس جو کچھ چاہتی تھی وہ تو حقیقت کا روپ دھار چکا ہے۔ تین سال بعد وہ اپنے قیام کی سوویں سالگرہ منائے گی اور ملک کو ہندو ریاست میں تبدیل کرنے کا اُس کا خواب بہت حد تک شرمندۂ تعبیر ہو چکا ہے۔ نریندر مودی نے کشمیری مسلمانوں کو دبوچنے کا عمل نہ صرف یہ کہ ترک نہیں کیا بلکہ تیز تر کر دیا ہے۔ شہریت کے متنازع قانون کے ذریعے لاکھوں غیر ہندوؤں کو بھارتی شہریت سے محروم کرنے کی تیاری کی جا چکی ہے اور اتر پردیش میں یوگی آدتیہ ناتھ مسلمانوں کے قتل کی راہ پر گامزن ہیں۔

اب سوال یہ ہے کہ کیا آر ایس ایس کو روکا جاسکتا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ بی جے پی نے ریاستی اسمبلیوں کے حالیہ انتخابات میں پانچ ریاستوں میں بھرپور کامیابی حاصل کی مگر یہ نکتہ بھی ذہن نشین رہے کہ پنجاب میں اُسے بھرپور ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا ہے۔ وہاں وہ ۱۱۷ میں سے صرف ۲ نشستیں حاصل کر پائی ہے۔ پنجاب میں ۶۰ فیصد سے زائد آبادی سکھوں کی ہے جن کے لیے خالص ہندو ریاست کا تصور کسی بھی اعتبار سے پُرکشش نہیں۔ انتہائی جنوبی ریاست کیرالا میں بھی بی جے پی کو ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا ہے۔ وہاں مسلمان، ہندو اور مسیحی تعداد میں مساوی ہیں۔ اس ریاست میں ہندو اپنے آپ کو واضح طور پر ایک الگ ثقافتی شناخت کے آئینے میں دیکھتے ہیں۔ یہ شناخت بی جے پی کی پیش کردہ شناخت سے ہٹ کر ہے۔ یہی معاملہ تامل ناڈو کا بھی ہے۔ وہاں ہندو واضح طور پر اکثریت میں ہیں مگر اُن کی اپنی ثقافتی شناخت ہے جو بی جے پی کی پیش کردہ شناخت سے یکسر مختلف ہے۔ تامل ناڈو میں بھی بی جے پی انتخابی کامیابی کے حوالے سے قدم جمانے میں اب تک کامیاب نہیں ہوسکی ہے۔

خیر، کیرالا اور تامل ناڈو سرحدی یا کنارے کی ریاستیں ہیں۔ باقی پورے ملک میں بی جے پی واضح طور پر اقتدار میں ہے یا پھر اقتدار سے بہت نزدیک۔ مارچ ۲۰۲۱ء میں بی جے پی نے مغربی بنگال کی اسمبلی کے انتخابات میں دوسری پوزیشن حاصل کی۔ یہ ریاست مجموعی طور پر سیکولر رہی ہے اور یہاں مسلمانوں کی آبادی ۳۰ فیصد ہے۔ اس سے قبل بی جے پی مغربی بنگال کی ۲۹۴ رکنی اسمبلی میں ۳ سے زیادہ نشستیں حاصل نہیں کر پائی تھی۔ اُسے ۱۰ء۴ فیصد سے زائد ووٹ نہیں ملے تھے۔ ۲۰۲۱ء میں بی جے پی نے ۷۷ نشستیں جیتیں اور اُس کے حاصل کردہ ووٹ ۳۸ فیصد تھے۔

اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ اس وقت بی جے پی کی سیاسی قوت بہت زیادہ ہے۔ کوئی بھی سیاسی جماعت اُسے چیلنج کرنے کی طاقت نہیں رکھتی۔ اور کوئی بھی سیاسی جماعت ہندو قوم پرستی کی بات کیے بغیر ووٹ حاصل کرنے کا بھی نہیں سوچ سکتی۔ آر ایس ایس بھی بہت مضبوط ہے۔ وہ اپنے ہندو قوم پرستی کے نظریے پر پوری طرح کاربند ہے اور بھارت کو خالص ہندو ریاست بنانے پر تُلی ہوئی ہے۔ ملک بھر میں کم و بیش ۴۰ کروڑ افراد ایسے ہیں جو آر ایس ایس اور بی جے پی کا ہندو برانڈ قبول نہیں کرتے۔ اُن کی طرف سے شدید مزاحمت کا سامنا ہوسکتا ہے۔ دوسری اہم بات یہ ہے کہ آر ایس ایس اور بی جے پی دونوں ہی مسلمانوں اور مسیحیوں کو دیوار سے لگانے پر یقین رکھتی ہیں۔ اس کے نتیجے میں معاشرے میں افتراق و انتشار بڑھے گا۔

ہندی کے مسئلے نے بھی معاملات کو مزید بگاڑا ہے۔ بھارتی وزیر داخلہ امت شاہ شمالی مشرقی ریاستوں میں دسویں جماعت تک ہندی کو لازمی مضمون کی حیثیت سے پڑھانے کی بات کرچکے ہیں۔ ان ریاستوں کا ہندی سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ حقیقت بھی نظر انداز نہیں کی جاسکتی کہ بی جے پی کے نظریات سے ذرا بھی مطابقت نہ رکھنے والے ریاستیں پنجاب، کیرالا اور تامل ناڈو قومی معیشت میں اہم ترین کردار ادا کر رہی ہیں۔ ان ریاستوں کے پیدا کردہ مالیاتی وسائل مرکز میں جاتے ہیں جہاں سے اُنہیں ملک کے پسماندہ علاقوں پر خرچ کیا جاتا ہے۔ ان پسماندہ علاقوں میں بی جے پی ہندو انتہا پسندی کو فروغ دینے میں مصروف ہے۔

بی جے پی کے اقتدار میں مسلمانوں کے لیے ہجوم کے ہاتھوں اور ریاستی مشینری کے ذریعے تشدد کا خطرہ بڑھتا جارہا ہے۔ دیگر اقلیتوں کے لیے بھی حالات بدتر ہوتے جارہے ہیں۔ مسیحیوں کو اور سکھوں کو بھی بی جے پی سے شکایات ہیں۔ اگر سیاسی قوت کو بنیاد بنا کر اپنی مرضی دوسروں پر تھوپنے کا عمل یوں ہی جاری رہا تو تمام اقلیتیں طاقت سے یکسر محروم ہوکر رہ جائیں گی۔

کانگریس اور دیگر سیکولر سیاسی جماعتیں بی جے پی کے سامنے بند باندھنے کی اپنی سی کوشش کر رہی ہیں۔ خالص ہندو ریاست کا نعرہ لگا کر بی جے پی نے اپنے لیے جو ووٹ بینک پکا کیا ہے اُسے کمزور کرنا آسان نہیں۔ دیگر سیاسی جماعتوں کو بھی ہندو وازم کی بات کرنا پڑ رہی ہے۔

بی جے پی کی ساری محنت بے کار ثابت ہو اگر وہ ملک میں اسلامی انتہا پسندی کے خطرے کا ڈھول نہ پیٹے۔ وہ مسلمانوں کے عزائم اور نظریات سے ڈرا ڈرا کر ووٹ لیتی آئی ہے اور یہ عمل فی الحال رکتا دکھائی نہیں دیتا۔ بی جے پی نے کسی زمانے میں اچھوت کہلائے جانے والے نچلی ذات کے ہندوؤں یعنی دَلتوں کو ہندو وازم کے دائرے میں لانے پر خاص توجہ دی ہے اور بہت حد تک کامیابی بھی حاصل کی ہے مگر اس حقیقت پر بھی تو غور کیا جائے کہ وہ نئے اچھوت بھی پیدا کر رہی ہے، جو ''مسلمان'' ہیں۔ (ترجمہ: محمد ابراہیم خان)

"The stoppable rise of Hindu nationalism". ("Foreign Affairs". April 13, 2022)

بقیہ: تیونس میں مطلق العنانیت کا پھیلاؤ

بنیاد پر وہ دیگر ذرائع سے بھی قرضے حاصل کرنے میں کامیاب ہو سکے گا۔ اس وقت تیونس کا قرضے حاصل کرنے کی اہلیت کے حوالے سے درجہ بہت ہی گرا ہوا ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ امریکا کا اس طور دباؤ ڈالنا خاصا بے باک اور خطرناک اقدام ہے مگر ہم دیکھ چکے ہیں امریکا کا دباؤ نہ ڈالنا بھی کم خطرناک نہیں ہوتا۔ اگر امریکیوں کو اس بات کا یقین ہے کہ جمہوریت بہت اچھی طرزِ حکومت ہے تو پھر اُنہیں ماننا پڑے گا کہ تیونس کے لیے بھی یہی طرزِ حکومت بہترین ہے۔ اگر ایسا نہ ہوا تو پھر بائیڈن انتظامیہ کی بڑھکیں معاملات درست کرنے میں ناکام رہیں گی اور یہ ثابت ہوجائے گا کہ امریکا باتیں تو بہت کرتا ہے مگر جب کچھ کرنے کا وقت آتا ہے تو پیچھے ہٹ جاتا ہے۔ (ترجمہ: محمد ابراہیم خان)

"Tunisia is sliding back into authoritarianism". ("washingtonpost.com". May 9, 2022)

اسلامک ریسرچ اکیڈمی کراچی کی شائع کردہ نئی کتاب

عالمی مسائل کے تناظر میں

پاکستان کی خارجہ پالیسی

پروفیسر ڈاکٹر سید صلاح الدین احمد

قیمت: ۴۰۰ روپے

اکیڈمی بک سینٹر۔ D-35، بلاک۔5

فیڈرل 'بی' ایریا، کراچی۔ فون: 021-36809201

تاریخ کا تسلسل اور تہذیبوں کی ہم آہنگی

دوسرا اور آخری حصہ

ڈاکٹر جاوید ظفر

کمیونزم کے سقوط اور تاریخ کے خاتمے (End of History) کے اعلان کے بعد ہنٹنگٹن نے فوکو یاما کے End of History کے نظریے سے متفق ہوتے ہوئے مستقبل کی دنیا کی تعریف تہذیبوں کے تصادم (Clash of Civilization) کے ذریعے کرنے کی کوشش کی اور دعویٰ کیا کہ اب مغربی تہذیب کی روایات دائمی ہیں، لیکن اسے دوسری تہذیبوں کی روایات سے نبرد آزما ہونا پڑے گا۔ اور یہ دیگر تہذیبیں باہمی طور پر بھی متصادم ہوں گی۔

چنانچہ مستقبل کی عالمی سیاسی بساط کو رخ دینے کے لیے مغرب نے نہ صرف بقیہ تہذیبوں کو اپنے نشانے پر رکھ لیا، بلکہ ان تہذیبوں کو آپس میں بھڑانے کے لیے بھی اکسایا۔ ہنٹنگٹن نے اپنے مقالے میں اس بات کا عندیہ دیا کہ اب دنیا میں تصادم کی بنیاد نظریہ اور معاش نہیں ہوں گے بلکہ تہذیبیں یا اس سے وابستہ روایات تصادم کی بنیادیں بنیں گی۔ یہ تصادم قومیت پر مبنی ریاستوں (nation states)، ملکوں اور مختلف تہذیبی گروہوں کے درمیان ہوگا۔ ہنٹنگٹن کی خاص بات یہ ہے کہ جہاں انھوں نے اسے ایک نظریے کے طور پر پیش کیا وہیں اسے مفروضہ (hypothesis) بھی کہا، یعنی جو ممکنات میں سے ہے وہ غلط بھی ثابت ہوسکتا ہے۔ آج تقریباً ۲۸ سال بعد اس نظریے پر گفتگو کی جاسکتی ہے اور پچھلے ۲۸ برسوں کی اتھل پتھل کو اس روشنی میں دیکھا جاسکتا ہے کہ آیا یہ ایک فطری نظریہ تھا یا اس کو امریکی سیاست دانوں اور پالیسی سازوں نے اپنے مفادات کے حصول کے لیے گڑھا تھا۔ افغانستان میں مغرب کی فوجی مشین اور جیو پولیٹکل ماڈل کی ناکامی نے اسے خاصا معنی خیز اور دلچسپ بنا دیا ہے۔ ہنٹنگٹن نے لکھا ہے:

“It is my hypothesis that the fundamental source of conflict in this new world will not be primarily ideological or primarily economic. The great divisions among humankind and the dominating source of conflict will be cultural. Nation states will remain the most powerful actors in world affairs, but the principal conflicts of global politics will occur between nations and groups of different civilizations. The clash of civilizations will dominate global politics. The fault lines between civilizations will be the battle lines of the future.”

یعنی ”میرا مفروضہ یہ ہے کہ اس نئی دنیا میں تصادم کا اہم مصدر بنیادی طور پر نظریاتی یا اقتصادی نہیں ہوگا۔ بنی نوع انسان کے درمیان عظیم انتشار اور تنازع کا اہم سبب تہذیبی ہوگا۔ قومیت پر مبنی ممالک عالمی امور میں سب سے طاقت ور تو ہوں گے، لیکن عالمی سیاست میں آویزش کی بڑی وجہ ممالک اور مختلف تہذیبی گروہوں کے نزاع ہوں گے۔ تہذیبوں کا تصادم عالمی سیاست پر غالب آجائے گا۔ تہذیبوں کے بیچ کی دراڑیں مستقبل میں میدان جنگ کی صفیں بن کر ابھریں گی“۔

ہنٹنگٹن کے اس نظریے کے بعد عالمی سیاست کو تہذیبوں کے تصادم کے چشمے سے دیکھا جانے لگا۔ خاص طور سے مسلم ممالک اور مغرب کے تعلقات کی تشریح اسی تناظر میں کی جانے لگی۔ ہنٹنگٹن نے آرنلڈ ٹوئن بی (Arnold Toynbee) کے تصورات تہذیب کو مانتے ہوئے انسانی تاریخ میں اکیس تہذیبوں کی نشان دہی کی، اور بتایا کہ اس وقت اب بس سات یا آٹھ تہذیبیں وجود میں ہیں: مغربی، کنفیوشین، جاپانی، اسلامی، ہندو، سلاوی آرتھوڈوکس (Slavic Orthodox)، لاطینی امریکی اور شاید افریقی تہذیب۔ ہنٹنگٹن نے صاف طور سے اشارہ کیا کہ ان تہذیبوں کے درمیان اختلافات نہ صرف حقیقی (real) ہیں بلکہ بنیادی (fundamental) بھی ہیں۔ اپنے اس نظریے میں انھوں نے اسلام پر خاص طور پر توجہ مرکوز کی اور دعویٰ کیا کہ اسلام پچھلے تیرہ سو سال سے یورپ اور مغرب سے برسر پیکار ہے۔ انھوں نے یہ بھی دعویٰ کیا کہ اسلامی تہذیب نہ صرف داخلی طور پر بلکہ اپنے پڑوسیوں سے بھی متصادم ہے، نیز اسلام خونیں سرحدیں رکھتا ہے۔ انھوں نے افریقی اور لاطینی امریکی تہذیبوں پر کوئی روشنی نہیں ڈالی اور نہ ہی وجہ بتائی کہ یہ اپنے آپ میں کیوں کر مکمل تہذیبیں ہیں۔ جاپانی اور ہندو تہذیبوں کے ساتھ مغرب کے تعلقات پر بھی خاموشی اختیار کی۔ ہاں، انھوں نے ہندو اور اسلامی تہذیبوں کے تصادم پر کچھ تفصیل ضرور دی ہے۔ لیکن ہندو تہذیب پر کوئی تفصیلی گفتگو نہیں کی۔ انھوں نے چین کے بجائے کنفیوشین (Confucian) تہذیب پر تفصیل سے بات رکھی ہے اور آنے والے وقت میں مغرب کے لیے اسے ایک خطرہ قرار دیا ہے۔ یہی بات انھوں نے روس کے بجائے سلاوی آرتھوڈوکس تہذیب کا ذکر کرتے ہوئے مغرب اور روس کے تعلقات پر کہی ہے اور اسے بھی مغرب کے لیے ایک خطرہ قرار دیا ہے۔ انھوں نے سرد جنگ کے بعد کی تہذیبی کشمکش کو من حیث المجموع مغرب بمقابلہ تمام تہذیبیں (West vs. the Rest) قرار دینے کی کوشش کی ہے، جس میں اسلام، سلاوی آرتھوڈوکس اور کنفیوشین تہذیبوں پر مغرب کے ساتھ کشمکش کے تصور کو پیش کیا ہے، جب کہ ہندو، افریقی، لاطینی امریکی اور جاپانی تہذیبوں کے ساتھ مغرب کے تعلقات پر کھل کر کوئی بات نہیں کی ہے۔ بحیثیت مجموعی سرد جنگ کے بعد کے عالمی نظام میں اسلام، روس اور چین کو مغرب کے لیے خطرے کے طور پر پیش کیا ہے۔

تہذیبیں کیا ہیں اور اس وقت دنیا میں کل کتنی مکمل اور ادھوری تہذیبیں وجود رکھتی ہیں یہ ایک لمبی بحث ہے۔

یوں تو تہذیبوں کی مختلف طریقوں سے تعریف کرنے کی کوشش کی گئی ہے، جس میں پہچان، مذہب، روایات، نسل اور جغرافیہ کو بنیاد بنایا گیا ہے، لیکن اس کو دو حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے: مذہبی تہذیب اور غیر مذہبی تہذیب۔ مذہبی تہذیب میں مذہب کا کردار بنیادی ہوتا ہے اور اس عقیدے کو ماننے والے لوگ ایک مکمل تہذیب کے گروہ کا حصہ سمجھے جاتے ہیں۔ غیر مذہبی تہذیب میں مذہب کو یا تو رد کر دیا جاتا ہے یا اس کا کردار آزادانہ طور پر تسلیم کیا جاتا ہے، کیونکہ مذہب کا تعلق اللہ سے ہوتا ہے تو خدا کی رہ نمائی کی حیثیت بھی کلیدی ہوتی ہے۔ اس میں مذہبی کتاب سب سے اہم ثبوت یا مصدر (source) ہوتی ہے۔ کسی تہذیب کے لیے ضروری ہے کہ وہ انسانی زندگی کا مکمل ضابطہ پیش کرے، خواہ وہ سماجی ہو، سیاسی ہو، مذہبی ہو یا معاشی ہو۔ محض چند تمدنی رسومیات کے نبھانے کا نام تہذیب نہیں ہے، بلکہ تہذیب وہ ہے جو دائمی ہو اور بدلتی ہوئی اقدار میں انسانی زندگی کی مکمل رہ نمائی پیش کرے۔ ہنٹنگٹن نے جن تہذیبوں کا تعارف کرایا ہے ان میں صرف دو مکمل طور پر پہچانی جاسکتی ہیں: اسلام اور مغرب۔ باقی تہذیبیں یا تو ماضی کے باقیات ہیں یا مکمل طور پر تصوراتی ہیں، یا ان میں دوسری تہذیبوں کی آمیزش بہت زیادہ ہے اور وہ انسانی زندگی کی مکمل رہ نمائی کا دعویٰ پیش نہیں کرتی ہیں۔ چین میں اس وقت کمیونسٹ تصور کی حکمرانی ہے اور کنفیوشیزم کے احیا کی کوئی تحریک نہیں ہے۔ کنفیوشین کے بارے میں بھی ابھی کوئی مکمل معلومات حاصل نہیں ہیں، جس کی بنیاد پر کسی مکمل تہذیب کا

احیا ہو سکے یا کسی نئی تہذیب کو قائم کیا جا سکے۔ سیاسی طور پر چین کمیونزم کا پیروکار ہے اور سماجی طور پر وہاں پوری طرح مغرب کی لبرل اقدار کے غلبے کا مشاہدہ کیا جا سکتا ہے، اور اگر مستقبل میں وہاں کمیونسٹ سیاسی نظام گر بھی جائے تو زیادہ سے زیادہ وہ ایک قومی ریاست میں تبدیل ہو سکتا ہے، جو پہلے ہی سے ایک مغربی نظام ہے۔ کنفیوشین کو ایک عظیم چینی فلسفی کے طور پر تو پیش کیا جا سکتا ہے اور اسے چینی قومیت کو ابھارنے کے لیے استعمال کیا جا سکتا ہے، لیکن ایک مکمل تہذیب کو قائم کرنے کے لیے ناکافی ہے۔ جاپان یا جاپانی بھی ایک مکمل تہذیب نہیں ہیں، کیونکہ وہاں کچھ مقامی رسوم کی موجودگی ہو سکتی ہے لیکن مکمل تہذیبی ڈھانچے کی موجودگی، جس کو خالص جاپانی کہا جا سکتا ہو نہیں ہے۔ اس وقت جاپان کو مغربی تہذیب کی نظریاتی توسیع کہا جا سکتا ہے اور اس میں مغربی تہذیب کے حوالے سے کوئی منفی تاثرات بھی نہیں پائے جاتے، کیونکہ پڑوسی چین اور روس سے جاپان کے تعلقات لمبے وقت تک خراب رہنے کے اثرات ہیں اس لیے وہ ابھی مغربی سیاسی بلاک کا حصہ تو بنا رہے گا لیکن تہذیبی طور پر وہاں کسی نئی تہذیب کے ابھرنے کے امکانات موجود نہیں ہیں۔

ہندو تہذیب ہندوستانی تہذیب ۔۔۔ جس کو سندھ کی تہذیب (Indus civilization) بھی کہتے ہیں ۔۔۔ کا حصہ رہی ہے۔ ہندوستانی تہذیب کے مرکزی جغرافیائی علاقے پر تو اسلام پہلے سے ہی ہے اور اب وہ ایک الگ ملک کے طور پر بھی، جس کو پاکستان کہتے ہیں، موجود ہے۔ ہندوستانی تہذیب اپنے جغرافیائی مرکز میں ڈھہنے کے بعد مختلف دھاروں میں بٹ گئی اور اس کی ایک شاخ ہندو تہذیب کی شکل میں سامنے آئی۔ ہندو تہذیب کو ہندوستان میں آریوں کے آنے اور رگ وید کی تشکیل سے بھی جوڑا جاتا ہے، جس سے اس کی حیاتیاتی اور بشریاتی پہچان بنتی ہے۔ لیکن رگ وید اور بعد کی مذہبی تحریکیں اور تحریریں اسے ایک مذہبی پہچان دیتی ہیں۔ ہندو تہذیب مختلف ادوار سے گزرتی ہوئی پچھلے ایک ہزار سال سے زوال پذیر ہے اور ایک نسلی اور اسطوری (mythological) تمدن میں تبدیل ہو چکی ہے۔ کیونکہ کتاب اور پیغمبر مذہبی تہذیب کی بنیاد ہوتے ہیں اور ہندو تہذیب دونوں سے منحرف ہو چکی ہے۔ پیغمبروں کی تو پہلے سے ہی پہچان گم ہے اور کتاب بھی اپنی اصل شکل میں موجود نہیں ہے۔ اور بنیادی کتاب وید کی جگہ مختلف افسانوی و رزمیاتی کتابوں نے لے لی ہے۔ اس لیے اس کے عقیدے میں شدید اختلافات پائے جاتے ہیں۔ سماجی ڈھانچہ پوری طرح زوال آمادہ اور ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہے، اور معاشی تصور کا تو پہلے ہی سے کوئی ذکر نہیں ہے۔ ہندو تہذیب کا صرف ایک ستون ہندو مذہب وجود میں ہے اور وہ بھی نہ صرف زوال آمادہ ہے بلکہ دن بدن متنازع ہوتا جا رہا ہے، جس میں مذہب کی متشدد پہچان پر زور ہے۔ اس کی بنیاد پر جو سیاسی اور سماجی تحریکیں ابھر رہی ہیں وہ تہذیب پر گفتگو کرنے کے بجائے ایک غیر واضح ماضی کے احیا پر زور دے رہی ہیں، جس سے اس میں نہ صرف ایک سطح پر اندرونی تضاد اور تعارض پیدا ہو رہا ہے بلکہ ملک کے مسلمانوں یا اسلام کو مصنوعی طور سے نشانے پر لینے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ مذہب انسان کی جس ضرورت کو پورا کرتا ہے وہ انسان کا خدا سے تعلق، خدا کی رہ نمائی اور نجات ہے۔ ہندو مذہب میں انسانوں کی بڑی تعداد کو ذات پات اور اونچ نیچ کے نظام میں بانٹ کر نہ صرف کچھ لوگوں کو نجات کی ضمانت دی گئی ہے، بلکہ باقی لوگ تمام تر کوششوں کے باوجود اس درجے سے محروم کر دیے گئے ہیں۔ جیسے جیسے ہندوستان میں تعلیم اور حقوقِ انسانی کا شعور بیدار ہوگا، ہم دیکھیں گے کہ یا تو بڑی تعداد کوئی دوسرا مذہب تلاش کر لے گی یا مذہب سے ہی بے زار ہو جائے گی۔ اگر ہندو مذہبی سیاست یا ہندوتوا کی سیاست اسی زور شور سے باقی رہی تو سیاسی اور سماجی طور سے ہندوستان ایک ہزار سال پہلے والے دور میں پہنچ سکتا ہے، کیونکہ ہندو تہذیب اور مذہب کا جغرافیہ بھی ایک ہی ہے، اسی لیے اس کے احیا کی باہر سے کوئی کوشش نہیں ہو سکے گی۔

ہر چند کہ لاطینی امریکا نے کئی مشہور تہذیبوں کو جنم دیا ہے، تاہم ان کے تاریخی مقامات کو چھوڑ کر اب کچھ نہیں بچا ہے۔ نہ صرف لاطینی امریکا کی بیشتر آبادی نابود ہو چکی ہے، بلکہ ان کی ریاست و سیاست پر غیر لاطینی امریکیوں کا قبضہ ہے۔ اگرچہ ان کے بعض ممالک کے تعلقات مغرب اور امریکا سے کشیدہ ہیں، لیکن اس کے وجوہ تہذیبی کشمکش کے بجائے سیاسی و نظریاتی ہیں۔ لاطینی امریکا کے بیشتر ممالک کمیونزم کے زیر اثر رہے ہیں اور اب بھی ہیں، جس کی بنا پر ان کی سیاست میں مغرب کے تئیں تصادم اور آویزش نظر آتی ہے۔ ادھر افریقی تہذیب بھی کوئی وجود نہیں رکھتی کیونکہ افریقا کا مکمل شمال اسلام اور مشرقی تہذیب کا حصہ ہے، دیگر ممالک یا تو مغرب کے بہت نزدیک ہیں یا باہمی و اندرونی نزاعات کا شکار ہیں۔ ایک مکمل تہذیب کے جو عناصر ہونے چاہئیں جن کی بنیاد پر افریقی تہذیب کی تعریف متعین کی جا سکے، وہ افریقا میں سرے سے موجود ہی نہیں ہیں۔

آرنلڈ ٹوئن بی نے تہذیبوں کے عروج و زوال کا تجزیہ کرتے ہوئے زوال آمادہ تہذیبوں اور معاشروں کی علامات کی نشان دہی کی ہے۔ اس نے کچھ خاص باتوں کی طرف اشارہ کیا ہے۔ اس کے بقول زوال آمادہ تہذیبوں اور معاشروں میں اپنے ہی بنائے ہوئے اداروں (institutions) کی پرستش کا مرض پیدا ہو جاتا ہے۔ وہ معاشرے خود ساختہ اداروں کو خدائی کے درجے پر رکھ دیتے ہیں۔ ٹوئن بی نے پارلیمنٹ کی مثال پیش کی تھی۔ ان دنوں ہندو معاشرہ بھی اسی دلدل میں بہت اندر تک دھنس چکا ہے اور ملک یا قوم جو خالص ایک انسانی ادارہ ہے، اسے نہ صرف خدائی کے درجے پر فائز کر دیا ہے بلکہ دیگر تمام قوموں سے بھی یہی مطالبہ کیا جا رہا ہے۔ اس سے پہلے گائے کے حوالے سے بھی ان کا یہی رویہ تھا۔ ان باتوں کو نہ صرف ملک میں رہنے یا نہ رہنے کی بنیاد قرار دیا جا رہا ہے بلکہ فساد اور خون خرابے کے ماحول کو بھی ہوا دی جا رہی ہے۔ ٹوئن بی نے زوال آمادہ معاشروں اور قوموں کی ایک اور علامت یہ بتائی ہے کہ وہ اپنے مزعومہ سنہرے ماضی کے احیا کے خوابوں میں جیتی ہیں جسے اس نے آرکائیوزم (archivism) کہا ہے، نیز مستقبل میں چھلانگ لگانے کی کوشش کرتی ہیں، جسے اس نے فیوچرزم (futurism) کا نام دیا ہے۔ ٹوئن بی کے مطابق یہ دونوں ہی مقاصد ناممکن الحصول ہیں۔ اس مرض میں اس وقت ہندو معاشرے کا بڑا حصہ مبتلا ہے؛ گاندھی اور نہرو اس بات کو اچھی طرح سمجھتے تھے۔ ایسا لگ رہا ہے کہ وہ ناکام

بقیہ: کنگ کرین کمیشن

۱۴۹۲ء اسپین میں ملک بدری کے دوران ۲۰ ہزار یہودی ایک ساتھ یا تو ہلاک ہو گئے یا انہیں ہلاک کیا گیا۔

۱۴۹۲ء سسلی اور مالٹا سے یہودیوں کو نکال باہر کیا گیا۔

۱۴۹۴ء ''کراکاؤ'' میں یہودیوں کو حکم دیا گیا کہ وہ صرف مخصوص علاقوں تک خود کو محدود رکھیں۔ پولینڈ نے پہلی یہودی حد بندی کا آغاز کیا۔

۱۴۹۸ء پرتگال میں ایک بھی یہودی باقی نہ رہنے دیا گیا۔

۱۵۴۱ء ''نیپلز'' سے یہودیوں کو نکال باہر کیا گیا۔

۱۵۵۰ء ''گینوآ'' سے یہودیوں کو نکال باہر کیا گیا۔

۱۹۳۵ء تا ۱۹۴۱ء ہٹلر نے ان گنت یہودیوں کو انسانیت سوز سلوک سے دوچار کر کے عظیم تباہی مچائی۔

(حوالہ مختلف ویب سائٹس)

ثابت ہوں گے۔ آرکائیوزم اور فیوچرزم نے معاشرے میں بے سمتی اور لامقصدیت پیدا کردی ہے جس سے وہ اندرونی ٹوٹ پھوٹ کا شکار (implode) ہوسکتا ہے۔ قرائن کہتے ہیں کہ یہ عمل اسی صدی میں مکمل ہوجائے گا۔

ہنٹنگٹن نے روس کو براہ راست دشمن قرار دینے کے بجائے سلاوی آرتھوڈوکس کو بھی مغربی تہذیب کے مدمقابل ایک تہذیب کے طور پر پیش کیا ہے۔ یہ درست ہے کہ سلاوی آرتھوڈوکس رومن کیتھولک سے کچھ معاملوں میں اختلاف رکھتے ہیں لیکن وہ تہذیبی طور پر کم وبیش یکساں ہیں۔ روس میں بوڑھے افراد چرچ میں تو جاتے ہیں لیکن سیلوک آرتھوڈوکس کے ایک تہذیب کے طور احیا کرنے کے کوئی آثار موجود نہیں ہیں۔ روس کا مغرب سے تصادم تہذیبی نوعیت کی بنیادوں پر نہیں ہے بلکہ مکمل سیاسی مفاد پر مبنی ہے۔ اس کی تازہ مثال یوکرین اور روس کے درمیان جنگ ہے، حالانکہ یوکرین اور روس دونوں ہی سیلوک آرتھوڈوکس چرچ کے پیرو ہیں، لیکن سیاسی طور پر اور بین الاقوامی سیاست کے اعتبار سے ایک دوسرے کے دشمن بنے ہوئے ہیں۔ روس تہذیبی وجوہ کے بجائے تاریخی و سیاسی وجوہ سے مغرب کے ساتھ متصادم رہے گا۔

اسلامی تہذیب ساتویں صدی میں وجود میں آئی جب حضرت محمدؐ نے نبوت کا اعلان کیا اور انسانوں کی رہ نمائی کے لیے قرآن وسنت کو پیش کیا۔ تب سے اب تک تمام تر نشیب و فراز کے باوجود اسلامی تہذیب اپنی اصل شکل میں موجود ہے۔ جغرافیائی اعتبار سے جب اسلامی تہذیب نے اپنی آنکھیں کھولیں تو اس وقت اس کے اردگرد بہت سی زوال زدہ تہذیبیں تھیں۔ مشرق میں چینی و ہندو تہذیبیں اور مغرب میں یونانی ورومی تہذیبیں تھیں۔ یہ تہذیبیں تاریخ کا کھنڈر بن چکی تھیں اور اپنی توانائی کھوچکی تھیں، چنانچہ سیاسی وسماجی اتھل پتھل سے گزر رہی تھیں۔ صرف یورپ میں عیسائی تہذیب باقی تھی۔ اپنے ابتدائی دور میں اسلامی تہذیب نے ایک معرکہ آرا کردار ادا کیا اور ان زوال پذیر تہذیبوں کے ورثے کو تحفظ بخشا۔

ہندوستانی اور یونانی تہذیب کے سرمائے کو نہ صرف محفوظ کیا بلکہ اسے دنیا کے سامنے پیش بھی کیا اور اسے نئی بلندیوں سے روشناس کرایا۔ اگرچہ صلیبی جنگیں ہوئیں، جنھیں بعض یورپ اور مسلم حکمرانوں کے درمیان آویزش کہا جاسکتا ہے، لیکن یہ بات بھی درست ہے کہ کبھی پوری دنیا کے مسلمان یکجا ہوکر یوروپ سے متحارب نہیں ہوئے۔ اس میں کچھ علاقائی سیاست کی کارفرمائی بھی تھی، جو خالص مفادات پر مبنی تھی۔ جہاں اسلام نے زوال آمادہ ہندوستان میں ایک نئی روح پھونکی، جغرافیائی اعتبار سے یکجا کیا، ایک نئی سیاسی رہ نمائی دی، ایک نئے سماج کی بنیاد رکھی اور سب سے اہم یہ کہ اسے ایک مکمل دین پیش کیا جو اس کے زوال زدہ دین کے کافی قریب تھا۔ بعد میں ہم دیکھتے ہیں کہ اسلامی تہذیب کی پھونکی ہوئی روح سے ہندوستان نہ صرف دوبارہ کھڑا ہوا بلکہ آج یہ ایک بڑی طاقت کے طور پر ابھر کر سامنے آرہا ہے۔ یہ بات الگ ہے کہ جو طاقت ایک ہزار سال پہلے اس کے زوال کے لیے ذمہ دار تھی اگر وہ دوبارہ حاوی ہوگئی تو پھر ویسے نتائج دیکھنے پڑ سکتے ہیں۔

مغرب نے جو آج ترقی کی ہے وہ اس کی نشاۃ ثانیہ کا ثمرہ ہے اور تمام معتبر مؤرخین اس میں اسلام کے کردار کو کلیدی مانتے ہیں۔ یونانی تہذیب کا سب سے بڑا کارنامہ اس کا فلسفہ تھا جس نے ہزاروں برسوں میں ارتقا کیا تھا۔ یونان کے زوال کے بعد اسلام نے اس سرمائے کو نہ صرف سنبھالا بلکہ اس کو سنوارا بھی اور اس کو ترقی دے کر یورپ تک پہنچایا بھی۔ یہی فلسفہ بعد میں مغربی تہذیب کے ابھرنے کا سبب بنا۔ ہنٹنگٹن کا یہ دعویٰ کہ اسلام اور مغرب تیرہ سو سال سے متصادم ہیں نہ صرف خلافِ واقعہ ہے بلکہ زہرناک بھی ہے۔

چین اور روس اسلامی تہذیب کے شمال مشرق اور مشرقی کناروں پر موجود ہیں۔ تاریخی طور پر دونوں کے تعلقات اسلام سے نہ صرف بہت گہرے رہے ہیں بلکہ دونوں ملکوں کی سیاسی تاریخ میں اسلام نے کلیدی کردار ادا کیا ہے۔ دونوں ملکوں کی جغرافیائی سیاست اور کمیونزم کی آمد کے بعد اس صورت حال میں ایک منفیت آگئی تھی لیکن اب کمیونزم کے زوال اور عالمی سیاست میں تبدیلی کے بعد دونوں ملک اسلام کے ساتھ اپنے تعلقات کی تجدید کررہے ہیں اور کافی خوش آئند اشارے دے رہے ہیں۔

لبرل اکانومی اور اب نیو لبرل اکانومی خاص طور پر اپنی استحصالی نوعیت اور صارفیت کی بنا پر ہمیشہ تنازعات کے گھیرے میں رہی ہیں۔ اب ان کے بنیادی تصورات پر گفتگو کی جانے کی ضرورت ہے۔ اسلام کے ساتھ مغرب کا مثبت انگیجمنٹ مغربی تہذیب کو بنیادی اصلاحات کی طرف لے جاسکتا ہے۔

اس وقت دنیا میں بس ڈھائی تہذیبیں اپنا وجود رکھتی ہیں: اسلامی، مغربی اور دیگر تمام باقی ماندہ تہذیبی دھارے۔ اسلامی تہذیب نہ صرف دنیا کے جغرافیائی وسط میں واقع ہے بلکہ تہذیبوں کی بحث کے مرکز میں بھی ہے۔ اسلام 'تصادم' کے بجائے 'تفاہم' پر یقین رکھتا ہے اور برے سلوک کا جواب دوستانہ رویے سے دینے کو عین دین قرار دیتا ہے۔ لہٰذا اسلام اپنی طرف سے کسی بھی طرح کے تصادم کا حامی نہیں ہے۔ اگر دوسری تہذیبیں اور باقی ماندہ تہذیبی دھارے مثلاً ہندو، چین، روس اگر کسی قسم کی تصادمی پالیسی اختیار کرتے ہیں، تب بھی اسلام اس سے نپٹنے کا حامی ہے اور افہام وتفہیم کو ترجیح دیتا ہے۔ چنانچہ ہم نے دیکھا کہ جب یورپ کے بیشتر ممالک اپنی اپنی فوجوں کو افغانستان میں جنگ میں جھونک رہے تھے اور بے شمار عام افغانیوں کو قتل کررہے تھے، تب بھی طالبان نے یورپ کے عام شہریوں کو نقصان پہنچانے کی کوشش نہیں کی، جب کہ ان کے لیے ایسا کرنا آسان تھا۔

اس دور میں اسلام مغرب کے ساتھ سب سے گہرے طور پر وابستہ ہے، اور مغرب بھی تہذیبی اعتبار سے سب سے زیادہ اسلام ہی کے ساتھ انگیج ہے۔ مغربی تہذیب کی تین بنیادیں ہیں: جمہوریت، سیکولرزم اور لبرلزم۔ اور تینوں اس وقت بحرانی دور سے گزر رہی ہیں۔ جمہوریت پر لابی نے قبضہ کرلیا ہے جس کے بدترین مظاہر عراق و افغانستان کی جنگیں اور مختلف ممالک میں لابی کے اثرات پر مبنی فیصلے ہیں۔ اسرائیل کے تعلق سے مغرب کا جو رویہ ہے وہ بھی اسی صورت حال کا عکاس ہے۔ افریقا اور لاطینی امریکا میں جو بحران ہے وہ مختلف ادوار میں آمروں، فوجی تختہ پلٹ (military coup d'etat) اور خانہ جنگیوں کی مغربی حمایت ہی کا شاخسانہ ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مغرب کی جمہوری اقدار کو سنجیدہ خطرہ لاحق ہے اور اسے اس سے نکال کر نئی اقدار عطا کرنے اور نئے جمہوری نظام میں لائے جانے کی ضرورت ہے، جو لابی مفاد اور مادہ پرستی کے بجائے سچائی کی بنیاد پر فیصلے کرسکے۔ مذہب اور سماج کی علیحدگی سیکولرزم کا خاصہ ہے اور مغربی تہذیب اب بھی اس پر مضبوطی سے قائم ہے۔ تاہم بعض واقعات اشارہ کرتے ہیں کہ اس موقف میں کچھ تخفیف بھی واقع ہوئی ہے۔

تازہ صورت حال یہ ہے کہ اسلامی تہذیب اب مغربی تہذیب اور باقی ماندہ تہذیبی دھاروں کے ساتھ تہذیبی تعاملی رابطے میں آگئی ہے۔ اگر اسلامی دنیا اور اس کے دانش ور سنجیدہ کوششیں کریں تو ایک تہذیبی یک جہتی پیدا کرنے اور نئے منظرنامے کے نمودار ہونے کی توقع کی جاسکتی ہے اور اسلامی تہذیب وہی کردار ایک بار پھر ادا کرسکتی ہے جو اس نے اپنے عروج کے دور میں کیا تھا۔

(بحوالہ: ماہنامہ 'زندگی نو' نئی دہلی۔ مئی ۲۰۲۲ء)

کنگ کرین کمیشن

رضی الدین سید

اسرائیل کی تاریخ سمجھنے کے لیے ماضی کی ایک اہم دستاویز ''کنگ کرین کمیشن'' کا مطالعہ انتہائی اہمیت کا حامل ہے۔ یہ وہ دستاویز ہے جس کا اب کوئی ذکر بھی نہیں کیا جاتا۔ جب جنگ عظیم اول ختم ہوئی تو فلسطین پر عربوں، صہیونیوں، برطانیہ، اور فرانس کے متضاد دعووں پر کوئی بھی مفاہمت نہ کرسکا۔ اس لیے ۱۹۱۹ء میں امریکی صدر روڈ رولسن اور اس کے ''جمہوریت کے دیوانے'' امریکیوں نے خلافتِ عثمانیہ کے سابق عرب صوبوں میں ''کنگ۔کرین کمیشن'' روانہ کیا تاکہ ان صوبوں کے لوگوں سے بعداز جنگ تصفیے کی خاطر معاملے کے لیے ان کی خواہشات معلوم کی جائیں۔(حوالہ برٹانیکا)

کنگ کرین کمیشن نے بہت سارے جائزوں کے بعد ایک رپورٹ پیش کی جس میں کہا گیا تھا کہ:

☆ فلسطین کے ۹۰ فیصد باشندے غیر یہودی ہیں اور وہ فلسطین کے اندر ایک یہودی ریاست کے قیام کے مخالف ہیں۔

☆ اس کے باوجود اگر فلسطین ان کے حوالے کیا گیا تو صہیونیوں کی خواہش ہے کہ وہ ارضِ فلسطین سے تمام غیر یہودیوں (یعنی عربوں) کو نکال باہر کردیں گے۔

☆ فلسطین کی ریاست کے قیام سے فلسطینیوں کے حق خود مختاری کی خلاف ورزی ہوگی۔

☆ انہوں نے سفارش کی کہ صہیونی، فلسطینی باشندوں کی خواہشوں کا احترام کریں اور اپنی یہودی ریاست کے قیام کے لیے کوئی اور سرزمین تلاش کریں۔

چونکہ یہ رپورٹ صہیونیوں کے مقاصد کو فاش کرنے والی تھی، اس لیے وہ اس رپورٹ سے بے انتہا ناراض ہوئے۔

اپنے ملک کی جو تاریخ اسرائیلی، عام طور پر بیان کرتے ہیں اس میں وہ کنگ کرین کمیشن کا ذکر ہی نہیں کرتے۔ اور اگر کرتے بھی ہیں تو اہمیت کو کم کر کے بیان کرتے ہیں۔ راقم کے خیال میں جمہوریت سے محبت رکھنے والوں کو ضرور سوچنا چاہیے کہ کنگ۔کرین رپورٹ ایک بہت بڑا واقعہ تھی اور بہت سے غلط واقعات کے خلاف واضح ثبوت تھی۔ یعنی:

☆ صہیونیوں کو معلوم تھا کہ وہ لوگوں کی تمناؤں کے خلاف کام کر رہے ہیں۔

☆ صہیونیوں نے جان بوجھ کر جمہوریت کو سبوتاژ کیا ہے۔

☆ فلسطینی آج جس حق کا مطالبہ کررہے ہیں، امریکا نے کل اس کے جائز ہونے کی خود ہی تصدیق کی تھی۔

کنگ۔کرین کمیشن سے چند اقتباسات

☆ ''یہودیوں کے لیے ایک قومی وطن کے مطالبے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ فلسطین کو یہودی مملکت قرار دیا جائے۔''

☆ ''اس طرح کی کوئی یہودی ریاست اس وقت تک قائم نہیں ہوسکتی، جب تک کہ فلسطین میں موجود غیر یہودی آبادی کی مذہبی وشہری آزادیوں کو بری طرح پامال نہ کیا جائے''۔

☆ ''اپنے ۴ جولائی ۱۹۱۸ء کے خطاب میں صدر روڈ رولسن نے ان چار بڑے مقاصد کی خاطر، جن کے لیے دنیا کی متعلقہ اقوام جدوجہد کررہی ہیں۔ مندرجہ ذیل اصول وضع کیا کہ 'ہر مسئلے کے حل۔۔۔کی بنیاد۔۔۔خواہ وہ خود خطہ زمین سے متعلق ہو یا خطہ زمین کی سیاست ہے۔۔۔ یہ ہے کہ جو قوم اس مسئلے کے حل سے براہ راست تعلق رکھتی ہے، وہ اسے بغیر کسی دباؤ کے از خود قبول کرلے۔ نہ یہ کہ کوئی دوسری قوم، جس کا اس حل سے کوئی مادی مفاد وابستہ ہو، وہ اس کا کوئی ایسا مختلف حل نکالے جس کے باعث اس خطے یا قوم پر اس کا کوئی بیرونی دباؤ یا اس کی آقائیت قائم ہوجائے۔۔۔''

☆ ''اگر اصول یہی ہے کہ جمہوری حکمرانی قائم کی جائے تو اس میں فیصلہ کن حیثیت فلسطینیوں کی رائے کی ہونی چاہیے۔ وہ فلسطین کا مستقبل کیا طے کرنا چاہتے ہیں؟۔۔۔لہٰذا یاد رکھنا چاہیے کہ فلسطین کی غیر یہودی آبادی۔۔۔کل آبادی کا دس میں سے نو حصہ۔۔۔صہیونیوں کے اس سارے منصوبوں کا شدید ترین مخالف ہے۔۔۔ اس طرح کا ذہن رکھنے والی کسی قوم پر یہودیوں کی لاتعداد ہجرت کو مسلط کرنا، اور اس پر اپنی زمین سے دستبرداری کی خاطر معاشی وسماجی دباؤ ڈالنا، اوپر درج کیے گئے اصولوں اور کسی قوم کی حق آزادی کی بدترین خلاف ورزی ہوگی، اگرچہ کہ ان ساری کارروائیوں کو قانونی الفاظ کے جامے میں ڈھال دیا جائے''۔

☆ کمشنروں نے جس برطانوی افسر سے بھی رابطہ کیا، اس نے یہی بتایا کہ صہیونی منصوبہ سوائے طاقت کے اور کسی طریقے سے تکمیل نہیں پاسکتا۔ یہ چیز بذات خود صہیونی منصوبے کی شدید ترین ناانصافی کو نمایاں کرتی ہے۔

☆ یہودی نمائندوں کے ساتھ کمشنر حضرات کی کانفرنسوں میں یہ حقیقت بار بار ابھر کے سامنے آئی کہ صہیونی فلسطین میں غیر یہودی آبادی کا مکمل صفایا چاہتے ہیں۔

☆ صہیونی نمائندوں کی جانب سے اٹھایا گیا بنیادی دعویٰ کہ دو ہزار سالہ گذشتہ آبادکاری کی بنیاد پر وہ فلسطین پر اپنا ''حق'' رکھتے ہیں، کسی بھی لحاظ سے قابل توجہ نہیں ہے۔

(حوالہ کتاب ''عربس اینڈ ازرائیل'' از رون ڈیوڈ، ترجمہ قومیں جو دھوکا دیتی رہیں، رضی الدین سید)

وکی پیڈیا

مندرجہ بالا بیان کی تصدیق ''وکی پیڈیا'' بھی کرتا ہے۔ بتاتا ہے کہ اسرائیلیوں کے لیے مشرق وسطیٰ اور فلسطین کے وسط میں ایک الگ خطے کے حصول کی خاطر امریکی صدر ''وڈ رو ولسن'' نے دو اشخاص ہینری کنگ اور چارلس کرین پر مشتمل ایک ٹیم شام اور فلسطین میں بھیجی تاکہ وہ وہاں جاکر معائنہ کریں اور دیکھیں کہ اس بارے میں عربوں کی سوچ کیا ہے؟

کمیشن نے اگرچہ اس کی رپورٹ ۱۹۱۹ء میں دے دی تھی لیکن حالات کی متوقع خرابی کی بنیاد پر اس کی اشاعت تین سال بعد ۱۹۲۲ء میں کی گئی۔ رپورٹ میں واضح طور پر سفارش کی گئی تھی کہ علاقے میں اسرائیل کا قیام کبھی عمل میں نہ لایا جائے۔ نیز یہاں، یہودیوں کی ہجرت بھی روکی جائے۔ (اس وقت فلسطین میں محض ۱۰ فیصد یہودی آباد تھے)۔ کمیشن نے اس ضمن میں نہ صرف بیسیوں صہیونی، عیسائی، و عربی باشندوں سے رائے لی تھی بلکہ علاقے گھوم پھر کر حالات کا خود بھی جائزہ لیا تھا۔ وکی پیڈیا اقرار کرتی ہے کہ کمیشن کے ارکان اگرچہ صہیونیت ہی کے ہمدرد تھے لیکن خطے کی سیاسی و مذہبی صورت حال دیکھ کر انہوں نے اسرائیل کے نام سے کسی بھی نئی ریاست کے قیام کی مخالفت کی تھی۔ دونوں ارکان نے متفقہ طور پر محسوس کیا کہ اسرائیل کے قیام سے صہیونی قیادت کا صاف مقصد علاقے سے مسلمانوں کو نیست و نابود کرنا ہے۔ اس نے کہا تھا کہ 'یہ ریاست، صرف مسلمانوں کے تمام حقوق کی پامالی ہی پر قائم ہوسکتی ہے'۔ کمیشن کے ارکان نے صدر امریکا کی توجہ دلائی تھی کہ اگر انہوں نے خطے میں کوئی یہودی ریاست قائم کی تو فوجی طاقت کے بغیر یہ کام نہیں ہوسکتا۔

رپورٹ، صدر پر مزید واضح کررہی تھی کہ چونکہ یہ خطہ، یہودی، مسلم، اور عیسائیوں، تینوں کا متفقہ ومقدس ہے، اس لیے اسے کسی ایک قومیت کے نام وقف نہیں کیا جاسکتا۔

یہودیوں کی جلاوطنی وبربادی،صلیب کے سائے

۸۶ ق م۔ شاہ بابل نے یروشلم پر قبضہ کیا اور عبادت خانے کو تباہ کردیا۔

۴۷۲ق م۔ یونانی بادشاہ انہولنس نے یروشلم پر حملہ کر کے نوتعمیر ہیکل سلیمانی کا نام ونشان مٹادیا اور اسے بت خانے میں تبدیل کردیا۔

۷۰ ۔رومی بادشاہTitus نے یروشلم کو تباہ وبرباد کردیا۔

۱۳۳۵ء۔ رومی بادشاہ ہیڈریان نے یروشلم کو ایک بار پھر تباہ وبرباد کردیا۔

(حوالہ کتاب: عربز اور ازرائیل۔ از رون ڈیوڈ، ترجمہ 'قومیں جو دھوکا دیتی رہیں' رضی الدین سید)

۱۱۰۰۔۱۵۰۰ء یہودی جرمنی سے فرار کیے گئے۔

۱۲۲۸ء اسپین میں یہودیوں کو قانونی طور پر لباس کے اوپر نمایاں نشان آویزاں کرنے کا حکم دیا گیا۔

۱۱۲۶ء پولینڈ: گرجاؤں نے فیصلے صادر کیے کہ یہودی عیسائیوں کے ساتھ اکٹھے نہیں رہ سکتے۔

۱۲۷۹ء ہنگری: گرجاؤں نے حکمنامہ جاری کیا کہ یہودی اپنے لباس پر بائیں جانب سرخ کپڑا اڑائیں۔

۱۳۲۱ء فرانس: ایک گڑھے میں ۱۶۰ یہودی دفن کیے گئے۔

۱۳۵۵ء اسپین میں ایک مشتعل ہجوم نے بارہ ہزار یہودیوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔

۱۳۹۱ء میجورکا کے جزیرے میں پچاس ہزار یہودی تہہ تیغ کیے گئے۔

۱۳۹۱ء سسلی میں بڑے پیمانے پر یہودیوں کا قتل عام کیا گیا۔

۱۳۹۹ء پولینڈ۔پہلی بار یہودیوں کے خلاف تعزیری کارروائیاں کی گئیں۔

۱۴۱۲ء ''کیسٹائل'' اسپین میں یہودیوں کو علیحدہ علاقے میں رہنے اور امتیازی پٹی پہننے پر مجبور کیا گیا۔

۱۴۲۰ء لیون۔فرانس سے یہودیوں کو نکال باہر کیا گیا۔

۱۴۲۰ء طولوس۔فرانس میں یہودی طبقوں کا صفایا کردیا گیا۔

۱۴۷۴ء سسلی میں یہودیوں کا ایک بار پھر بڑے پیمانے پر قتل عام کیا گیا۔

۱۴۹۲ء اسپین میں ایک لاکھ ساٹھ ہزار یہودی ملک بدر کیے گئے۔

باقی صفحہ نمبر ۱۱

بقیہ: ''ہمیں امریکا کا دشمن نہ سمجھا جائے''

ذریعے سب پر یہ واضح کردینا چاہتا ہوں کہ طالبان کی تعلیم کے حوالے سے مخالفت یا مخاصمت نہیں پائی جاتی۔ ہاں، موزوں میکینزم پر کام ہورہا ہے اور اللہ نے چاہا تو بہت جلد اچھی خبر سننے کو ملے گی۔ طالبان قیادت اس حوالے سے سنجیدہ ہے اور متعلقہ سمت میں کام کرنے کی ہدایت بھی کی ہے''۔

جب کرسٹینا امان پور نے پوچھا کہ کیا آپ اپنی بیٹی کو تعلیم دلوانا چاہیں گے تو افغانستان کے عبوری وزیر داخلہ نے کہا ''میں بتاچکا ہوں کہ ہم میں سے کوئی بھی لڑکیوں کی تعلیم کے خلاف نہیں۔ سوال موزوں ماحول اور میکینزم کی تیاری کا ہے۔ ہم اس حقیقت کو تسلیم کرتے ہیں کہ تعلیم اللہ کا عطیہ ہے جس کی ہر حال میں قدر کی جانی چاہیے۔ ہم صرف یہ یقینی بنانا چاہتے ہیں کہ تعلیم کا عمل افغان روایات اور اطوار کے مطابق ہو۔ دین کی تعلیم وتصریح بالکل واضح ہے۔ بنیادی سوال حجاب اور پردے کا ہے۔ ہم اس امر کو ہر حال میں یقینی بنانا چاہتے ہیں کہ طالبات کا احترام کیا جائے، اُن کی عصمت محفوظ رہے''۔

عالمی برادری نے طالبان کا اقتدار تسلیم کرنے کے لیے جو چند نمایاں شرائط عائد کی ہیں اُن میں لڑکیوں کی تعلیم بھی شامل ہے۔ اس کے باوجود طالبان نے اب تک لڑکیوں اور خواتین کے کام کرنے پر پابندی عائد رکھی ہے اور بہت سی لڑکیوں کو ساتویں جماعت سے آگے اسکول جانے کی اجازت نہیں دی ہے۔ (ترجمہ: محمد ابراہیم خان)

"Don't see us as US enemy: Haqqani network leader ". (daily "Dawn" Khi. May 17, 2022)

اسلامک ریسرچ اکیڈمی کراچی کی شائع کردہ کتب

حضرت ابراہیمؑ۔امامِ انسانیت

ڈاکٹر محمد رضی الاسلام ندوی

قیمت: ۴۰۰ روپے

اوراقِ سیرت ﷺ

مولانا سید جلال الدین عمری

قیمت: ۴۰۰ روپے

اکیڈمی بک سینٹر۔ فون: 021-36809201

اطلاع برائے قارئین

معزز قارئین! پندرہ روزہ ''معارف فیچر'' گزشتہ ۲۲ برسوں سے آپ کے سامنے دنیا بھر سے دستیاب ایسی معلومات کا انتخاب پیش کرتا آرہا ہے، جو اسلام سے دلچسپی اور ملت اسلامیہ کا درد رکھنے والوں کے غور وفکر کے لیے اہم یا مفید ہوسکتی ہیں۔

اپنی اشاعت سے آج تک ادارہ قارئین کو ''معارف فیچر'' کی ترسیل بلاتعطل جاری رکھے ہوئے ہے، تاہم دنیا کے بدلتے ہوئے منظر نامے اور جدید تقاضوں سے ہم آہنگ کرنے کے لیے جولائی ۲۰۲۲ء سے ''معارف فیچر'' کی اشاعت کو صرف آن لائن ہی کرنے کا فیصلہ کیا گیا ہے۔

اس ضمن میں گزارش کی جاتی ہے کہ اگر آپ چاہتے ہیں کہ آپ کو ''معارف فیچر'' کی مطبوعہ صورت میں ترسیل جاری رہے تو ہمیں اپنا نام، ڈاک کا مکمل پتا، رابطہ نمبر اور برقی پتا جلد از جلد ارسال کیجیے۔

نوٹ: ایسے تمام قارئین جن کے کوائف ۳۱ مئی ۲۰۲۲ء تک موصول نہیں ہوں گے، انہیں ''معارف فیچر'' کی مطبوعہ صورت میں ترسیل روک دی جائے گی۔

(ادارہ)

سیرتؐ کے موضوع پر اسلامک ریسرچ اکیڈمی کی شائع کردہ کتاب

اوّل صدارتی ایوارڈ یافتہ

سیرتِ سید الابرار ﷺ

منیر احمد خلیلی

قیمت: ۱۲۰۰ روپے

اکیڈمی بک سینٹر۔ D-35، بلاک۔5

فیڈرل 'بی' ایریا، کراچی۔ فون: 021-36809201

بدلتی دنیا۔ نئے بلاک کی تشکیل

ابوصباحت

ہر دور میں طاقت کی کہانی یہ رہی ہے کہ جس کے ہاتھ میں معاملات آ گئے اُس نے دوسروں، بالخصوص کمزوروں، کو اپنی مٹھی میں اور پاؤں کے نیچے رکھنے کو ترجیح دی ہے۔ چشمِ فلک نے طاقت کے تماشے بہت دیکھے ہیں۔ اِن تماشوں نے دنیا کو ہر دور میں کچھ کا کچھ بنایا ہے۔ کبھی کسی کو بالا دستی ملتی ہے اور کبھی کسی کو۔ ویسے بھی اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے کہ ''جب ایک گروہ حد سے گزر جاتا ہے تو ہم اُس پر کسی دوسرے گروہ کو بالا دست بنا دیتے ہیں''۔ جس نے بھی طاقت پا کر اللہ کے طے کردہ اصولوں سے انحراف کیا اُس کا انجام بُرا ہی ہوا۔ تاریخ ایسے بہت سے طاقتوروں کی گواہ ہے جنہوں نے پوری دنیا کو اپنی جاگیر سمجھا اور پھر اِس خام خیالی کا نتیجہ بھی بھگتا۔

دو ہزار سال کی تاریخ گواہ ہے کہ مختلف خطوں کو اقتدار و اختیار ملا اور پھر واپس بھی لے لیا گیا۔ اسلام سے قبل مغربی دنیا کے مسیحیوں اور فارس کے مجوسیوں کو اقتدار ملا۔ دونوں خطے پوری دنیا کے ایک بڑے حصے پر راج کرتے رہے۔ معاملات جب بگڑے تو اِن کے اقتدار و اختیار کی بساط بھی لپٹ گئی۔

ابتدائی دور کے مسلمانوں کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ انہوں نے شدید بے سر و سامانی کے عالم میں، محض قوتِ ایمانی کے ذریعے دو سپر پاورز کو دُھول چٹائی۔ مسلمانوں نے رومیوں کو اس قدر پسپا ہونے پر مجبور کیا کہ اُن کا تعاقب کرتے کرتے خود ویانا کے دروازے تک پہنچ گئے۔ وہاں ثابت قدم رہنا ممکن نہ ہو سکا تاہم اسپین پر تو کم و بیش آٹھ سو سال حکومت رہی۔ یہ مسلم امہ کا سنہرا دور تھا۔ جدید ترین علوم و فنون اور فنونِ لطیفہ میں مسلمانوں نے باقی دنیا کو پیچھے چھوڑا۔ یونان کی دانش سے خود بھی فائدہ اٹھایا اور اہلِ یورپ کو بھی مستفید ہونے کا موقع فراہم کیا۔ یورپ تک یونان کے مفکرین کا نتیجۂ فکر اہلِ عرب کے ذریعے پہنچا۔ بغداد میں دارالترجمہ قائم کیا گیا جس نے دنیا بھر کی اعلیٰ ترین کتب کے تراجم تیار کیے۔ یہ تراجم بعد میں یورپی زبانوں کا علمی ذخیرہ وسیع اور زرخیز بنانے میں خاصے معاون ثابت ہوئے۔ جب اسلامی دنیا علم و فن کے مہر تاباں سے منور تھی تب یورپ جہالت کی تاریکیوں میں ڈوبا ہوا تھا۔ پاپائیت نے علم و فن اور دانش کے پنپنے کی گنجائش ختم کر دی تھی۔ جہالت اور فرسودہ رسوم کی ایسی بھرمار تھی کہ جو بھی عقل کی بات کرتا، جاہل اور رب کا منکر کہلاتا تھا۔ کلیسا کی طاقت اس قدر تھی کہ کائنات کے صریح اور واضح مظاہر کو بھی اُن کی اصلیت کے ساتھ بیان کرنے کی اجازت نہیں تھی۔ ہیئت کا علم اہلِ یورپ تک اہلِ عرب کے ذریعے پہنچا۔ طب کی تعلیم و تربیت میں بھی مسلمانوں نے اہلِ یورپ کی بہت مدد کی۔ صدیوں تک مسلم حکماء کی کتابیں یورپ کی درس گاہوں میں پڑھائی جاتی رہیں اور اُن کی مدد ہی سے یورپ کے بہت سے اہلِ علم نے مختلف شعبوں میں تحقیق و تصنیف کا بازار گرم کیا۔ یورپ میں علم و فن کی ترویج کے حوالے سے مسلمانوں کے کردار سے متعلق بیسیوں کتب موجود ہیں۔ خود یورپ کے اہلِ دانش نے تسلیم کیا ہے کہ مسلمانوں نے یورپ کی سرزمین پر قدم نہ رکھا ہوتا تو تاریک زمانوں کی میعاد زیادہ ہوتی اور ممکن ہے کہ یورپ اٹھارہویں صدی تک جہالت کے اندھیروں میں غرق رہتا۔

یورپ نے نشاۃِ ثانیہ کے ذریعے اپنے آپ کو دوبارہ کچھ کرنے کے قابل بنایا۔ چودھویں اور پندرہویں صدی عیسوی میں اہلِ یورپ نے اپنے آپ کو دوبارہ منوانے کی شاہراہ پر سفر شروع کیا۔ یہ سفر شدید کس مپُرسی کے عالم میں شروع ہوا۔ یورپ کے اہلِ علم و فن کو دانش کی روشنی پھیلانے کی پاداش میں کلیسا کی طرف سے شدید مزاحمت اور جبر کا سامنا کرنا پڑا۔ پاپائیت کو جب اپنا محل لرزہ براندام دکھائی دیا تو اُس نے ہر اُس انسان کے خلاف جانے کا فیصلہ کیا کہ جو لوگوں کو عقل سکھاتا ہو، اندھی عقیدت سے دور کرتا ہو اور زندگی میں ایسی تبدیلیوں کا نقیب ہو جو پاپائیت کی روح کو چیلنج کرتی ہوں۔

یورپ کے اہلِ علم و فن کو کلیسا کے خلاف جانے میں بہت کچھ سہنا پڑا۔ اِس حقیقت سے انکار علمی سطح پر بد دیانتی ہوگی کہ اہلِ یورپ نے جدید ترین علوم و فنون کی روشنی پھیلانے میں شدید ردِعمل کا سامنا کیا اور ہر حال میں ثابت قدم رہے۔ یورپ کے اہلِ علم و فن کی ساری کی ساری جد و جہد چونکہ پاپائیت کے خلاف تھی اس لیے فطری اور منطقی طور پر وہ مذہب بیزار ہو گئے۔ الحاد نے سر اٹھایا۔ پاپائیت نے جہالت کے ذریعے جو بے ہودہ رسوم پروان چڑھا رکھی تھیں اور اندھی عقیدت کے نام پر جو بے بنیاد عقائد پھیلا رکھے تھے اُن کے خلاف جب علمی اور عوامی سطح پر ردِعمل پیدا ہوا تو مذہب ہی کی بنیادیں ہلا دی گئیں۔ اہلِ یورپ نے یہ سمجھ لیا کہ جدید ترین فطری علوم و فنون میں پیش رفت اُسی وقت ممکن ہے جب مذہب کا انکار کر دیا جائے۔ یوں یورپ میں الحاد دراصل مزاج کا حصہ نہیں تھا بلکہ ردِعمل کا نتیجہ تھا۔ کلیسا نے مذہب کے نام پر جو کچھ کیا اُس کا یہی نتیجہ برآمد ہونا تھا۔

یورپ نے جب فطری علوم و فنون میں پیش رفت یقینی بنانے کی ٹھانی تو اس راہ پر بڑھتے ہی چلا گیا۔ محض تین صدیوں میں یورپ نے خود کو باقی دنیا سے اس قدر الگ اور بلند کر لیا کہ ایک دنیا اُن کی بالا دستی کے آگے سرِ تسلیم خم کرنے پر مجبور ہوئی۔ فطری علوم و فنون میں پیش رفت کا مطلب تھا زیادہ سے زیادہ طاقت کا حصول۔ ایجادات نے یورپ میں کئی طاقتوں کو جنم دیا۔ کئی خطوں کو یورپی طاقتوں نے پامال کیا۔ افریقا، مشرقِ وسطیٰ، ایشیا اور دیگر خطوں میں یورپی طاقتوں نے انتہائی بدمستی کے عالم میں اپنے لیے زیادہ سے زیادہ گنجائش پیدا کرنے کی کوشش کی۔ جن خطوں کو فتح کر لیا جاتا وہ نو آبادیات میں شامل کر لیے جاتے۔ یورپی طاقتوں نے یہ کھیل کم و بیش تین صدیوں تک کھیلا اور اس دوران اپنی طاقت میں اضافہ کرنے کے ساتھ ساتھ مختلف خطوں کو کمزور اور برباد رکھنے پر بھی توجہ دی۔ اِس کا منطقی نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ یورپ اور باقی دنیا میں بہت واضح فرق دکھائی دینے لگا۔

اٹھارہویں صدی عیسوی میں جب امریکا اپنی خامیوں اور کمزوریوں پر قابو پا کر ترقی کی راہ پر گامزن ہوا تب یورپ کے لیے حقیقی مسابقت پیدا ہوئی۔ یہ مسابقت زیادہ دیر قائم نہ رہ سکی۔ امریکا میں بھی وہی لوگ اقتدار و اختیار پر متصرف تھے جو یورپ سے آئے تھے۔ مذہب بھی ایک تھا۔ یوں دونوں خطوں نے مل کر باقی دنیا کو زیرِ نگیں رکھنے کا عمل شروع کیا۔

امریکا اور یورپ نے مل کر کم و بیش ایک صدی تک پوری دنیا کو زیرِ نگیں رکھا ہے۔ اس دوران کئی خطوں کو مکمل طور پر تاراج کر دیا گیا۔ امریکا نے اپنے اڑوس پڑوس میں جنوبی امریکا کے ممالک کو کمزور رکھنے پر پوری توجہ دی ہے۔ جنوبی ایشیا، شمالی افریقا، مشرقِ وسطیٰ، جنوب مشرقی ایشیا اور چند دوسرے خطوں کا بھی یہی حال ہوا ہے۔ یورپ اور امریکا کا گٹھ جوڑ دنیا بھر میں شدید عدم مساوات کا باعث بنا ہے۔ عالمی سیاست و معیشت پر بھی ان دونوں خطوں نے مل کر قبضہ کر رکھا ہے۔ عالمگیر نوعیت کے فیصلے کرنے والے اداروں پر یہ دونوں خطے قابض ہیں اور اپنی مرضی کے فیصلے پوری دنیا پر مسلط کرتے ہیں۔

(۔۔۔۔ جاری ہے!)

چین میں گندم کا بحران

Keith Bradsher

اس سیزن میں چین میں ہر گاؤں میں گندم کی صورتحال مختلف ہے۔ بیجنگ کے مشرق میں ایک فیلڈ ناہموار تھا۔ دوسرے میں تباہ کن بارشوں نے گندم کے پودوں کو تباہ کر دیا تھا۔ اس سے اگلے گاؤں کے کھیتوں میں چمکتی دھوپ میں گندم کے پودے لہلہا رہے تھے۔ چین میں اگلے ماہ موسم سرما کی گندم کی فصل کی کٹائی شروع ہونے والی ہے اور یہ عالمی سطح پر بڑھتی ہوئی اشیائے ضروریہ کی قیمتوں کے دوران ایک بے یقینی کا شکار ہے۔ خاص طور پر روس اور یوکرین کی گندم کے محتاج ممالک کے زیادہ متاثر ہونے کا خدشہ ہے۔ اگر چین میں گندم کی فصل اچھی نہ ہوئی تو خوراک کے مہنگا ہونے کی وجہ سے غریب ممالک میں غربت اور بھوک میں اضافے کا خدشہ ہے۔ گزشتہ جولائی سے گندم کی قیمتیں ۸۰ فیصد تک بڑھ چکی ہیں۔ روسی حملے اور بحیرۂ اسود کے محاصرے کی وجہ سے یوکرین سے سپلائی بُری طرح متاثر ہوئی ہیں۔ یو این فوڈ پروگرام والوں نے خوراک کا بحران شدید ہونے سے قبل فوری طور پر یوکرینی پورٹس کھولنے کا مطالبہ کر دیا ہے۔

یوکرین جنگ شروع ہونے سے قبل ہی توانائی کی قیمتیں بھی بڑھ چکی ہیں، جس کی وجہ سے کھاد کی پیداوار متاثر ہوئی ہے۔ کھاد کی قیمتیں بڑھنے سے اس کا استعمال کم ہوگیا ہے، چنانچہ فصلوں کی پیداوار بھی متاثر ہوئی ہے۔ خراب موسموں نے بھی بحران کو مزید سنگین بنا دیا ہے۔ اس سال بھارت میں سخت گرمی پڑی ہے۔ خشک سالی نے امریکا اور مشرقی افریقا کے بڑے زرعی میدانوں کو بُری طرح متاثر کیا ہے۔ مشرقی افریقا کے ممالک، جو خوراک کے لیے روس اور یوکرین کے محتاج تھے شدید متاثر ہوئے ہیں۔ کئی علاقوں میں روٹی کی قیمت دوگنا ہو گئی ہے۔ گندم کا سب سے بڑا پروڈیوسر اور صارف چین ہے جس کا قیمتوں میں اضافے سے متاثر ہونا یقینی ہے۔

ایک فارم کی مالکہ رین روکسیا کے مطابق، موسم خزاں میں آنے والے سیلابوں کی وجہ سے گندم کی فصل اچھی نہیں ہوئی۔ کورونا کی وجہ سے لگنے والے لاک ڈاؤن کی بنا پر کھاد بھی وقت پر نہ مل سکی۔ اب لگتا ہے کہ اس سال گندم کی فصل بُری طرح متاثر ہوئی ہے۔ ۱۹۶۰ء کی دہائی میں ماؤزے تنگ نے جو سخت ترین قوانین متعارف کرائے تھے، ان کی روشنی میں لازمی تھا کہ ملک کے کم از کم ۴ لاکھ ۶۳ ہزار مربع میل یعنی فرانس سے بھی دوگنا رقبے پر فارمنگ کی جائے۔ کاشتکاری کے قابل اس رقبے کا ہدف پورا کرنے کے لیے کئی مرتبہ دیہاتوں کو بلڈوز بھی کر دیا جاتا ہے۔ جب سے ٹرمپ دورِ حکومت کے دوران امریکا کے ساتھ اشیائے صَرف کے حوالے سے تجارتی مسئلہ پیدا ہوا تھا، اس وقت سے چین کے صدر شی جن پنگ نے خوراک کی سیکورٹی پر بھرپور فوکس کر رکھا ہے۔ چینی کمیونسٹ پارٹی کے پالیسی جریدے 'قی شی' میں ۳۱ مارچ کو شائع شدہ ان کی تقریر میں انہوں نے وارننگ دی تھی کہ ''آنے والے دنوں میں خوراک کی رسد اور طلب میں اضافہ ہونا یقینی ہے۔ اس کے علاوہ عالمی صورت حال بھی پیچیدہ تر ہوتی جارہی ہے، اس لیے ہمیں فوڈ سیکورٹی کو یقینی بنانے کے لیے ہائی الرٹ پر رہنا پڑے گا''۔

چین کے وزیر زراعت ٹینگ رین جیان نے تو مارچ کے ابتدا ہی میں عالمی برادری کو اپنی اس تشویش سے آگاہ کر دیا تھا جب انہوں نے کہا تھا کہ موسم خزاں کی شدید بارشوں اور سیلابوں کی وجہ سے اس سال گندم کی فصل کی پیداوار کا ریکارڈ بہت بُرا ہوگا۔ زراعت کی وزارت کے دیگر حکام بھی وقتاً فوقتاً اس بحران کے حوالے سے وارننگ جاری کرتے رہے ہیں، تاہم انہیں غذائی بحران کے اس قدر شدید ہونے کی توقع نہیں تھی۔ مغربی ممالک کے زراعت کے تجزیہ کار جنہوں نے سیٹلائٹ تصاویر کے ذریعے چین میں فصلوں کی پیداوار کا جائزہ لیا ہے، وہ چینی حکام کے مقابلے میں کم تشویش کا اظہار کر رہے ہیں۔ امریکا کے محکمہ زراعت کے خیال میں اس سال چین میں گندم کی پیداوار گزشتہ سال کے مقابلے میں تین فیصد کم ہوگی۔

شنگھائی کموڈٹیز فرم سٹونیا کنسلٹنگ کی بانی اور مارکیٹ ریسرچ ڈائریکٹر ڈیرین فریڈرکس کا کہنا ہے ''میرا نہیں خیال کہ یہ سب کچھ اتنا تباہ کن ثابت ہونے والا ہے مگر ایسا بھی نہیں ہے کہ اس سال معمول کی فصل ہوگی''۔ ماضی میں اور خاص طور پر ۲۰۱۱ء میں اعلیٰ چینی حکام مایوسی پر مبنی انتباہ جاری کرتے رہے ہیں اور اس کا مقصد نچلے درجے کے چینی حکام کی توجہ گندم کی فصل کی طرف مبذول کرانا تھا۔ دنیا بھر میں خوراک کی ممکنہ قلت کا خوف چینی حکام کو اس سال انتہائی محتاط رویہ اپنانے پر مجبور کر رہا ہے۔ واشنگٹن میں قائم انٹرنیشنل فوڈ پالیسی ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے سینئر ریسرچ فیلو جوزف گلابر کہتے ہیں ''چین کے پاس کسی بھی ہنگامی صورتحال سے نمٹنے کے لیے خوراک کا ایک معقول ذخیرہ محفوظ ہے مگر اس میں سے گندم کا کچھ ذخیرہ اس قدر گھٹیا طریقے سے محفوظ کیا گیا تھا کہ اب اسے صرف جانوروں کی خوراک کے طور پر ہی استعمال کیا جاسکتا ہے''۔

کورونا وائرس کی وجہ سے بھی حالات سنگین شکل اختیار کرتے جارہے ہیں۔ اس موسمِ بہار میں صوبہ جیلین جیسے زرعی علاقوں میں سخت ترین لاک ڈاؤن نے زراعت کو بُری طرح متاثر کیا ہے۔ اپارٹمنٹس میں مقیم کئی خاندانوں کو گروسری کی شاپنگ کے لیے بھی جانے سے روک دیا گیا تھا، انہیں زندہ رہنے کے لیے بڑی تگ و دو سے اپنی خوراک کا انتظام کرنا پڑا۔ کئی لوگ پہلے ہی سے خوراک کا ذخیرہ کرنا شروع ہو گئے تھے کیونکہ انہیں خدشہ تھا کہ انہیں بھی جلد اس طرح کے لاک ڈاؤن کا سامنا کرنا پڑ سکتا ہے۔ ۴۳ سالہ چی وین لنگ کا کہنا ہے کہ میں نے اب تک چار گیلن خوردنی تیل اور منرل پانی کی ۱۰۰ بوتلیں، چار ہفتے کے لیے دودھ اور گوشت خرید لیا ہے جس سے میرے فریج اور فریزر بھر چکے ہیں۔ مس چی کا کہنا تھا کہ اگرچہ میں نے اپنے لیے خوراک ذخیرہ کر لی ہے مگر میں پھر بھی انسدادِ کورونا وبا کے لیے کیے گئے اقدامات پر یقین رکھتی ہوں''۔ جب میرے جیسے درمیانی عمر کے لوگ حالات پر غور کرتے ہیں تو وہ اور بھی قدامت پسند ہو جاتے ہیں۔ ہمیں حکومتی اقدامات پر پورا اعتماد ہے مگر ہم پوری تیاری کی مدد ہی سے کسی خطرے کو ٹال سکتے ہیں''۔

چین کو اپنے فوڈ اسٹاک کے حوالے سے جو پریشانی لاحق ہے، وہ عالمی سپلائی چین کی وجہ سے بڑھ بھی سکتی ہے۔ چین کے پاس دنیا بھر میں سب سے زیادہ فارن کرنسی ریزروز موجود ہیں اس لیے وہ عالمی منڈی سے اپنی ضرورت کے مطابق جتنی چاہے گندم خرید سکتا ہے مگر اس کے گندم خریدنے سے عالمی سطح پر اس کی قیمتوں میں اضافے کے باعث بہت سے غریب ممالک اپنی ضرورت کی گندم نہیں خرید سکیں گے۔ چین کے اگلے اقدام کا انحصار اس امر پر ہے کہ گندم کی فصل کیسی پیداوار دیتی ہے۔ چین کے مختلف علاقوں کے کاشتکار گندم کی فصل کے بارے میں متنوع بیانات دے رہے ہیں۔ سب کے خیال میں سیلاب کا پانی جتنی جلدی ان کے کھیتوں سے نکل جائے گا گندم کی فصل اتنی اچھی ہوگی، تاہم ان سب کا کہنا تھا کہ ہمارے ہاں گندم کی فصل اچھے طریقے سے پک رہی ہے اور یہ یقیناً اچھی پیداوار دے گی۔

"War and weather sent food prices soaring. Now, China's Harvest Is Uncertain". ("nytimes". May 11, 2022)